# ميرزا فتحعلي آخوندزاده

# منٹو کے نمایندہ افسانے

اطہر پرویز

مکتبہ اُردو اَدب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد

مطبع ——— طفیل پریس لاہور

قیمت ——— ۵۰/- روپے

# ترتیب


| | |
|---|---|
| پیش لفظ | ۷ |
| نیا قانون | ۳۱ |
| کالے شلوار | ۴۵ |
| ہتک | ۶۳ |
| ممد بھائی | ۸۸ |
| بو | ۱۰۷ |
| موذیل | ۱۱۶ |
| ٹھنڈا گوشت | ۱۴۴ |
| بابو گوپی ناتھ | ۱۵۳ |
| کھول دو | ۱۷۲ |
| ممی | ۱۷۷ |
| ٹوبہ ٹیک سنگھ | ۲۲۴ |
| سڑک کے کنارے | ۲۳۳ |
| جانکی | ۲۴۱ |
| پھندنے | ۲۶۴ |

# پیش لفظ

اردو افسانے کی عمر خاصی مختصر ہے لیکن اس مختصر عرصے میں اس نے غیر معمولی ترقی کی۔ پریم چند کے بعد تو افسانہ نگاروں کا ایک تانتا سا بندھ گیا۔ اور بعض ایسے افسانے تخلیق ہوئے جنھیں عالمی معیار کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ سعادت بہت کم زبانوں کو حاصل ہے کہ اس کے افسانے کے ابتدائی دور میں ہی متعدد بڑے قد آور افسانہ نگار سامنے آئے۔ یہ اردو زبان کی خوش قسمتی ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری اور ممتاز مفتی جیسے افسانہ نگاروں نے عظیم افسانے تخلیق کیے، جو دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں کی نسل میں سعادت حسن منٹو کا نام کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

منٹو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار ہے۔

منٹو پر سب سے زیادہ مقدمے چلے۔

منٹو نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جہاں پہنچنے کے لئے فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں جن کو بہت سے لوگ ممنوعات میں شمار کرتے ہیں۔

منٹو بڑا بے باک افسانہ نگار ہے۔ وہ بدنصیب بھی تھا کہ بیشتر لوگوں نے اسے سمجھا نہ اس کے افسانوں کو ـــــ اس کا احتساب ان لوگوں کے سپرد کیا گیا، جن کا کام عدالت کی کرسیوں پر وہ کام کرنا تھا جو سبزی فروش اپنی دوکانوں میں کرتا ہے، میرا مطلب ہے ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کا کام ـــــ

اس میں ان لوگوں نے ڈنڈی بھی ماری ـــــ یہ لوگ وہ تھے جو نہ ادب سے واقف تھے اور نہ زندگی سے۔ اس لئے ان سے کیا شکایت ـــــ لیکن وہ لوگ جو منٹو سے بھی واقف تھے اور ادب سے بھی، انھوں نے بھی کم ڈنڈیاں نہیں ماری ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ایک صحبت میں منٹو نے ایک افسانہ پڑھا، افسانے میں ایک اجڈ سپاہی کا کردار تھا جو بات بات پر گالی بکتا اور اکثر گالیاں خاصی مغلظات تھیں۔ لوگ منٹو پر برس پڑے، اس نے بار بار سمجھانے کی کوشش کی ـــــ "گالی منٹو نے نہیں بکی، اس سپاہی نے بکی، یہ جہاں آپ کے ہاتھ لگے، آپ اس کی تواضع کریں، منٹو نے تو صرف اپنے افسانے میں پیش کر دیا ہے۔ اس افسانے میں اور کئی باتیں ہیں۔ آپ اس گالی کے پیچھے پڑ گئے۔ ان باتوں کو دیکھنے اور سننے کے لئے آمادہ نہیں، آپ کا جی چاہے آپ گالی دے لیں، لیکن افسانے کو ضرور سمجھنے کی کوشش کریں۔"

منٹو سے ناراضگی کا ایک بڑا سبب یہ رہا ہے کہ اس کے بعض افسانوں کا تعلق جنسیات سے بھی ہے، اور جنسیات کی حیثیت ہمارے یہاں شجر ممنوعہ کی رہی ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد جب اردو افسانہ اپنے سفر پر روانہ ہوا تو شروع شروع میں جنسیات کا ذکر کسی حد تک بے باکی سے ہوا اور لوگوں نے اسے ترقی پسند تحریک کی ہی تحریک سمجھا ـــــ ترقی پسند تحریک چوں کہ سیاست کی پروردہ تھی اور اسے یہ ڈر ہوا کہ کہیں وہ بھی معتوب نہ ہو جائے۔ اس لئے اس تحریک کے حامیوں نے بھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ اپنے آپ کو اس سے علٰحدہ کر لیں چناں چہ جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جنسی مسائل اٹھائے ان کو مطعون کیا گیا۔ البتہ اس کا خیال رکھا گیا کہ افسانہ نگاروں کے جنس سے متعلق افسانوں کو نظر انداز کر کے ان کے بارے میں بات کی جائے مثال کے طور پر عصمت چغتائی کے افسانوں میں جہاں جنسیات کا ذکر آیا اس کی چشم پوشی کی گئی۔ عصمت کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک وہ حصہ جو ترقی پسندی سے متعلق تھا اور دوسرا وہ جس کا جنسیات سے تعلق تھا۔ چنانچہ موخر الذکر کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ منٹو کے مزاج کی ضد آڑے آئی۔ انھوں نے اپنی شخصیت کو اس طرح کاٹنے کی اجازت نہ دی۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند نقادوں کے درمیان

ادب میں جنسیات کے مسئلے پر ایک خاموش سمجھوتہ ہو گیا ہے تو انھوں نے برافروختہ ہو کر افسانے لکھے۔ منٹو کی شخصیت کو ان کے مزاج سے علٰحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کی شخصیت میں بے باکی تھی اور مزاج میں ضد ـــــ شخصیت کی بے باکی اور مزاج کی ضد نے ان کے افسانوں میں ایک تلخی اور تیکھا پن پیدا کر دیا ہے اور یہی منٹو کا فن بن گیا ہے۔ ہمیں منٹو کے فن کو سمجھنے کے لئے افسانہ نگاری کے اصولوں کے مطالعے سے اتنا فائدہ نہیں پہنچے گا جتنا خود منٹو کے افسانوں کے مطالعہ سے منٹو کے فن کا اندازہ ہوگا۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ ادب کا معیار نقادوں کی فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہوتیں بلکہ خود ادب ہوتا ہے، اور ان کی مدد سے ہی اس مخصوص فن کار کے فن کو سمجھا جا سکتا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں جنسیات کا ذکر جا بجا ملتا ہے اس لئے نہیں کہ وہ جنسیات سے محبت کرتا ہے، وہ جنسی لذت کے بیان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی میں جنسیات کے ذکر کو برا نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ اگر اس کو لذت لے کر بھی بیان کیا جائے تو بھی میرے نزدیک کوئی معیوب نہیں البتہ یہ شرط ہے کہ بیان قصے کے ڈھانچے میں سما سکے اور اس کی حیثیت محض اضافی نہ ہو۔ ہندوستان ادبیات و فنون لطیفہ میں جنس کو خوبصورتی سے علٰحدہ کر کے نہیں بیان کیا گیا۔ ادب میں جنس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ جنس کے ساتھ انسان کی جذباتی زندگی بھی وابستہ ہوتی ہے اور اس کا ادب سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ اسی لئے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کہتا ہے کہ جنس سے پیار کرنے کے لئے جنس کا احترام کرنا لازمی ہے۔" پھر یہ بات بھی ہے کہ جب زندگی کی ایک بنیادی جبلّت جنس ہے تو ادب اس سے کس طرح علٰحدہ رہ سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ادیب اپنی تخلیق سے، بے نیازی برتے، اپنے آپ کو اس سے علٰحدہ رکھے تو یقیناً اس ادب میں زندگی نہ ہوگی۔ چنانچہ جنس کا بیان کرتے وقت ادیب کو ذہنی طور پر اس جذباتی اور حسیاتی عمل سے گزرنا ہوگا جس کی کیفیت کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اگر منٹو کے افسانوں میں جنس کا اظہار ملتا ہے تو اس میں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ منٹو کے یہاں جہاں کہیں بھی جنسیات کا ذکر ہے وہ علٰحدہ سے نہیں معلوم ہوتا۔ وہ کہانی کا لازمی جزو ہے ـــــ وہ جس ماحول کو اپنی ان کہانیوں میں پیش کرتا ہے، یہ ماحول ہی ایسا ہے۔ طوائف کی شخصیت سے جنسیات

کو یوں بھی علٰحدہ کرنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ یہ اس کے کاروبار کا ضروری حصہ ہے۔ طوائف کے یہاں جاکر جائے نماز تلاش کرنا کسی ذہنی و روحانی صحت مندی کی دلیل نہیں ہے۔ پھر منٹو سے یہ توقع کیوں کی جائے کہ وہ رندوں کو کبھی گنے کا رس پیتے، قشقہ لگاتے اور تسبیح پڑھتے ہوئے دکھائے۔

جنسی جذبہ غیر فطری نہیں ـــــ یہ ایسا بھی نہیں کہ محض کسی کسی میں ہوتا ہے۔ اعضائے جسمانی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ پھر کیوں اس سے آنکھیں موندی جائیں۔ مانڈسلے نے بڑی صحیح بات کہی ہے کہ "اگر انسان کی جنسی خواہش اور ہر اس چیز کو جو ذہنی طور پر اس سے وابستہ ہے یا اس سے جنم لیتی ہے ختم کر دیا جائے تو زندگی سے شاعری اور شاید تمام اخلاقی جذبے کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ یہ ساری زندگی میں حرارت اور حسن پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کا انکار خود فریبی ہے۔"

منٹو کے یہاں بچے کی معصومیت اور اس کا مزاج ہے کہ اسے جس کام کے لئے منع کیا جائے پھر وہی کرتا ہے۔ منٹو نے اپنی شخصیت کی اس معصومیت کو برقرار رکھا۔ اس کے اندر وہ بچہ مرتے دم تک زندہ رہا۔ ہمارے اکثر نقاد منٹو سے ناراض ہو گئے اور اس کے جنسیاتی افسانوں کا مذاق اڑاتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ تم عورت کی روح کو دیکھو، اس کے جسم کو مت دیکھو ـــــ منٹو نے اس کے جسم کو اس روز سے دیکھنا شروع کیا جب کہ وہ ابھی نوخیز تھی اور خود اسے اپنے جسم کے نشوونما کا احساس نہیں تھا۔ "پھاہا" میں منٹو نے نرملا کی سن بلوغ کی نفسیات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں کہی گئی ہے لیکن زندگی کی ایک بنیادی نفسیاتی حقیقت کو بڑے فن کارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ نرملا کے بھائی کی ران پر پھوڑا نکلا ہے۔ اس وقت نرملا اس پر پھاہا لگاتی ہے۔ اور پھر پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نکی پر صابن کا چھوٹا سا بلبلہ اٹکا ہوا ہے ـــــ نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے ننھے سے ابھار پر جما دیا۔

منٹو کے افسانے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ حقائق پر مبنی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منٹو نے جو کچھ دیکھا ہے اسے من و عن پیش کر دیا۔ اس میں کسی قسم کی رنگ آمیزی نہیں کی۔ وہ اپنے تصورات کو ان

میں شامل نہیں کرتا۔ اسی لئے منٹو کو افسانہ لکھنے کے لئے ادبی و سیاسی نظریات کا سہارا نہیں لینا پڑا۔ منٹو نے جس زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کیا، اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی لئے اس پر اور تمام الزامات لگائے جاسکتے ہیں لیکن ہم اسے کسی نظریے کا "پروپگنڈسٹ" نہیں کہہ سکتے۔ لیکن جس زندگی کو اس نے پیش کیا ہے اسے دیکھ کر یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ یہ معاشرہ سچا معاشرہ نہیں ہے۔ اس میں انسانی شخصیت کا اصلی جوہر فنا ہو جاتا ہے۔ منٹو نے اپنے بارے میں صحیح بات لکھی ہے:

"زمانے کے جس دور میں ہم اس وقت گذر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں جس کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔" جب کسی کو اپنی بدہیئتی کا احساس ہوتا ہے تو وہ آئینہ دیکھنے سے کتراتا ہے۔ ممتاز حسین نے لکھا ہے:

"منٹو کسی خاص نظام کا نام نہیں لیتا لیکن کیا کہانی کا پس منظر کسی خاص پس منظر کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ منٹو کی کہانیاں اسباب کی طرف نہیں بلکہ اثرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

جب لاہور کی عدالت میں "ٹھنڈا گوشت" پر مقدمہ چلایا گیا تو منٹو نے عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

"سوال ہے جو چیز جیسی ہے اسے من وعن کیوں نہ پیش کیا جائے۔ بلاٹ کو اطلس کیوں بنایا جائے، غلاظت کے ڈھیر کو عود و عنبر کے انبار میں کیوں تبدیل کیا جائے حقیقت سے انحراف کیا ہمیں بہتر انسان بننے میں مدد و معاون ہو سکتا ہے؟"

اسی لئے میں اور بھی زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ منٹو کے افسانوں کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت "فن افسانہ نویسی" پڑھنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ خود منٹو کے افسانے ـــــ اس کے اپنے بیانات ـــــ اس کی تحریریں ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں اور ہم منٹو کے افسانوی فن کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

منٹو بنیادی طور پر انسان دوست ہے وہ جب کچھ انسانوں کا مذاق اڑاتا ہے، انھیں گالیاں دیتا ہے، برا بھلا کہتا ہے تو اس وقت بھی اس کے اندر کا انسان ان سے قربت محسوس کرتا ہے۔ ان کے اندر انسانیت

کے بہترین عناصر کو تلاش کرتا ہے۔

اچھوں کو تو سب ہی اچھا کہتے ہیں لیکن منٹو ان لوگوں میں بھی اچھائی تلاش کرتا ہے جو عرفِ عام میں برے سمجھے جاتے ہیں۔ وہ انھیں ملامت سے نہیں نکالتا اس لئے کہ اس کا کام اصلاحی نہیں۔ وہ تو اس گندگی میں اس کے باطنی حسن کو دیکھتا ہے۔ منٹو کے یہاں جسم فروش طوائف کے اندر کی عورت اس کاروبار میں اپنی شخصیت کے اصل جوہر کو نمایاں کرتی ہے۔ موذیل ایک ایسی عورت ہے جو اقدار کو نیک و بد کے خانوں میں نہیں بانٹتی لیکن نیکی کرتی ہے اس لئے نہیں کہ نیکی ایک بڑی قدر ہے اور اس پر عمل کرنا کارِ ثواب ہے۔ بلکہ وہ نیکی محض دوسروں کے کام آنے کے لئے کرتی ہے اور یہ کرتے ہوئے کسی پر احسان بھی نہیں کرتی ــــ یہ اس کا سوچا سمجھا عمل بھی نہیں بلکہ اس طرح کا اضطراری فعل ہے جو اس کی اپنی ذات کا پروردہ ہے

منٹو کے بڑے افسانے عام طور پر وہی ہیں جن کا خمیر بدنام کرداروں سے اٹھا ہے۔ منٹو نے زندگی کے حمام کو پیش کیا ہے اور اس حمام میں منٹو خود بھی نظر آتا ہے۔ عصمت نے منٹو کے بارے میں ایک موقع پر لکھا ہے:

"وہ دنیا کی ٹھکرائی، گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکالتا ہے۔ گھورا کریدنے کا اسے شوق ہے۔ تاکہ اسے دنیا کے سنوارنے والوں پہ بھروسہ نہیں۔"

یہ منٹو کی انسان دوستی کا مظہر ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانے اس کی غمازی کرتے ہیں ــــ اس عمل میں اگر اس کو اپنی قربانی کرنی پڑے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جب زینت کی شادی کی رات کو منٹو کی نظر اس کی مسہری پر پڑتی ہے جس پر پھول ہی پھول بچھے تھے تو اسے بے اختیار ہنسی آگئی کیوں کہ زینت نہ صرف یہ کہ بابو گوپی ناتھ کی داشتہ تھی۔ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا چکے تھے۔ وہ نگینہ ہوٹل کے ایک نمبر لیمین کے ساتھ سو چکی تھی۔ ــــ لیکن منٹو اب پھولوں کی سیج دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکل جاتا ہے "یہ کیا مسخرہ پن ہے" اور زینت اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی ہے "آپ مذاق کر رہے ہیں بھائی جان" اس وقت بابو گوپی ناتھ نے اپنے رومال سے زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ کہا "منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں ــــ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ

لیا ہوتا۔"

یہاں فن کار منٹو بابو گوپی ناتھ کے ساتھ ہے۔ سعادت حسن منٹو کے ساتھ نہیں اور اس نے بھی یقیناً بابو گوپی ناتھ کی طرح بھیگی آنکھوں سے بڑی ملامت کے ساتھ سعادت حسن کو دیکھا ہوگا۔ منٹو کے یہاں جو سچا فن کار ہے وہ اپنا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ وہ جب برا بھلا کہنے پر آتا ہے تو اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتا، بے نقط سناتا ہے۔ جو منہ میں آتا ہے کہتا ہے اور یہی منٹو کی بڑائی ہے۔ سچ پوچھئے تو منٹو غالب کے الفاظ میں وہ "قطرہ شبنم ہے جو ہو غار بیاباں پر"۔ منٹو سے بہتر انسان کا نباض اردو افسانہ نگاروں میں اس وقت بھی نہیں۔ وہ جس کردار کو پیش کرتا ہے اس کی شخصیت کے سینے میں اتر جاتا ہے اور ہم سے اس کی شخصیت کا کوئی گوشہ چھپا نہیں رہتا۔

منٹو نے اپنے افسانے براہ راست زندگی سے لئے ہیں۔ اس نے طوائفوں، عیاش عورتوں اور مردوں شرابیوں اور سرمستوں کو آمنے سامنے دیکھا ـــــ ہم دیکھتے ہیں کہ منٹو جب اپنے افسانوں کے کرداروں میں کھوتا ہوا نظر آتا ہے تو وہاں وہ اپنے آپ کو بھول نہیں جاتا ـــــ وہ دونوں پاؤں اٹھا کر، پیٹ میں گھٹنے اڑا کر بیٹھ جاتا ـــــ بالکل ایسے ہی جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر افسانے لکھا کرتا تھا۔ اور پھر ان کے کرداروں کی ایک ایک حرکت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اپنے ذہن میں جذب کر لیتا ہے۔ وہ "بابو گوپی ناتھ" میں ایک تماشائی ہے۔ "ممی" میں بھی اس کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہیں ہے۔ وہاں جو کچھ دیکھتا ہے اُسے بغیر کسی رنگ آمیزی کے اپنی بیوی صفیہ سے بیان کر دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ہم چل دیئے ـــــ راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کو من وعن سنا دیا تھا۔ اس کا (صفیہ) ردعمل یہ تھا کہ ممی بس اس کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ یا وہ اسے کسی اچھے اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی، جبھی اس نے چڑے سے لڑائی کی ـــــ میں خاموش رہا ـــــ اس کی تردید کی نہ تائید۔"

یہاں ان چند سطروں میں منٹو نے افسانے پر صداقت کی مزید مہر لگا دی۔ منٹو اپنے افسانوں میں اپنے قاری کو واقعہ کی صداقت کا بار بار یقین دلانے کے لئے اپنی بیوی صفیہ کی گواہی دلواتا رہتا ہے۔

بالکل ایسے ہی جیسے بچے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے اللہ کی قسم کھاتے ہیں۔

منٹو نہ صرف "گنجے فرشتے" کا تیرہواں کردار ہے۔ وہ سچ پوچھئے تو اپنے ہر افسانے کا لازمی کردار ہے اور اس کردار کا جا بجا عملاً اس کہانی میں کوئی ہاتھ نہ ہو، لیکن یہ کردار کہانی کو مجروح کئے بغیر ہٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ میں "کی تکنیک کو اتنے فن کارانہ انداز میں کسی اور افسانہ نگار نے نہیں پیش کیا۔ منٹو جب صیغۂ متکلم استعمال کرتا ہے تو کسی سے خطاب نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے آپ کو کرداروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور اس طرح اسے کرداروں کو سمجھنے اور اپنے قاری کو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ منٹو کی نمایاں خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے۔ وہ کرداروں کے نقوش کو اس خوبصورتی سے ابھارتا ہے کہ ہمیں ان کے ناموں کے پیچھے ان کے چہرے کے خدوخال صحیح طور پر نظر آتے ہیں اور ہم ان کو پہچان لیتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو اپنے قاری کے قریب لے آتا ہے یا یوں کہئے کہ اپنے قاری کو کرداروں کے پاس لے جاتا ہے۔

ہم نہ صرف ممی، چڈہ، وِن کترے، سعید اور غریب نواز کو قریب سے جانتے ہیں بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ کالونی پھر جاتی ہے۔ ہمیں وہ سارا ماحول نظر آتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ "سعیدہ کاٹج" یقیناً پونا میں ہوگی اور اگر آج بھی ہم وہاں پہنچ جائیں تو وہاں ہمیں شیشوں کے کیڑے سوکھتے نظر آئیں گے۔

اور شام کو سب لوگ بیٹھے ہوں گے۔ شراب کے جام چل رہے ہوں گے۔ رنجیت اور غریب نواز ہوں گے شکیل اور عقیل دونوں بھائی فلم کمپنی بنانے کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ وہیں کہیں میوزک ڈائرکٹر وِن کترے ہوگا اور چڈہ اس کے کدو لیسے سر پر ایک دھول جمائے گا اور وہ منٹو کا گلاس اپنے منہ سے لگا لے گا۔

منٹو حقیقتوں کا عکاس ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں حقیقتوں کا رنگ بھرنے کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ وہ اپنے کرداروں میں جان ڈالنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ وہ نہ صرف کرداروں کے ذریعہ حقیقت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ماحول کو بھی ایسا بنا کر پیش کرتا ہے ہمیں وہاں گوشت پوست کے انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

منٹو ان میں اپنے آپ کو شامل کر کے انھیں ہم سے اور قریب کر دیتا ہے اور جب اس سے بھی کام

نہیں چلتا تو جیسا کہ میں نے پہلے کہا گواہی کے لئے صفحہ کو بھی پیش کر دیتا ہے۔ "گنجے فرشتے" پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد علی عابد لکھتے ہیں :

"بظاہر یہ مجموعہ بارہ آدمیوں کے متعلق ہے لیکن درحقیقت اس کا موضوع ایک تیرہواں آدمی بھی ہے اور وہ خود منٹو ہے جس کی شخصیت اس کتاب میں بے نقاب ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ منٹو بمبئی کی حد درجہ پُرتصنع فلمی دنیا میں رہ کر بھی جذباتی رہا، خلوص کا خواہاں اور حامل۔ مزے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے اپنی جذباتیت کو، اپنی خوبیوں کو اور اپنے خلوص کو بڑے اہتمام سے پڑھنے والوں سے مخفی رکھنا چاہا ہے لیکن جو شخصیت اس کتاب میں سب سے زیادہ ابھری ہے وہ منٹو کی ذات ہے۔ معلوم نہیں کہ ترتیب میں ترتیب زمانی کس حد تک ملحوظ ہے لیکن سلسلہ وار مطالعے سے منٹو کی ایک شخصیت ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

منٹو اپنے کردار پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا لیکن یہ کردار ہمیں بڑا مانوس نظر آتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو کھانچے رہ جاتے ہیں انھیں قاری کا ذہن اپنے طور پر بھرتا ہے۔ ادب کے مطالعہ میں قاری کی بڑی اہمیت ہے، کیوں کہ ادب اسی کے لئے تو لکھا جاتا ہے۔ ادیب مصنف اگر اس تخلیقی عمل میں قاری کو بھی شریک کرلے تو کون سی بُری بات ہے۔ افسانہ رمز و ایما کا فن ہے۔ یہاں اختصار کی عمل داری ہے۔ یہاں کوئی بات تفصیل سے نہیں کہی جاتی۔ اسی لئے میرا خیال ہے کہ افسانے میں 'کہی' سے زیادہ 'ان کہی' کی اہمیت ہوتی ہے۔ منٹو کی نگاہ دور تک دیکھتی ہے۔ وہ باریک سے باریک گوشے تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ جزئیات کا فن کار ہے۔ لیکن تفصیل اس کے مزاج سے بعید ہے۔ وہ بڑے غور سے دیکھتا ہے اس لئے کہ اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ میز پر رکھی ہوئی دیا سلائی پر افسانہ لکھ سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بقول وقار عظیم "منٹو میز کے نیچے سے نظر گھما کر دیا سلائی کو دیکھتا اور اس پر لکھتا ہے۔"

منٹو کو معمولی کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا آتا ہے۔ یہ بات اس کے افسانے کے مواد کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے اور اس کی تکنیک کی بھی خصوصیت ہے اور کبھی کبھی تو وہ غیر معمولی بات کو بڑے معمولی سیدھے سادے انداز میں کہہ کر نکل جاتا ہے کہ ہم مبہوت ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ منٹو کے افسانے کا اختتام حیرت پر ہوتا ہے بلکہ حیرت تو ہمیں اس کے سادے انداز پر ہوتی ہے اور ہم سوچتے

رہ جاتے ہیں۔

"گورمکھ سنگھ کی وصیت" فساد کے دور کی کہانی ہے۔ جب ایک مسلمان گھرانا غیر مسلموں کے علاقے میں پھنس جاتا ہے۔ اس گھر میں چار فرد تھے۔ میاں عبدالحیٔ ریٹائرڈ سب جج، ان کی بیٹی صغریٰ، ایک لڑکا اور ستر برس کا ایک بوڑھا ملازم۔ سردار گورمکھ سنگھ کو ایک میاں صاحب نے ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سوئیوں کا ایک تھیلا ان کے گھر لے کر آیا کرتا تھا اور باپ کی موت کے بعد یہ فریضہ اس نے اپنے بیٹے سنتو کھ کے سپرد کیا اور لائق بیٹے نے اپنے باپ کو مرنے سے پہلے یہ وچن دیا تھا کہ اب وہ یہ کام کرے گا۔ اور وہ اس موقع پر سوئیاں لے کر آیا جب فساد اپنے شباب پر تھا اور میاں عبدالحیٔ بستر مرگ پر۔ جب صغریٰ بتاتی ہے کہ جج صاحب بیمار ہیں تو سردار سنتو کھ سنگھ کہتا ہے ——— "اوہ سردار جی زندہ ہوتے تو انھیں یہ سن کر بہت دکھ ہوتا۔ مرتے دم تک انھیں جج صاحب کا احسان یاد تھا اور کہتے تھے کہ وہ انسان نہیں دیوتا ہے ——— اللہ میاں انھیں زندہ رکھے ——— انھیں میرا سلام ———"

اور بیشتر اس کے کہ صغریٰ اس سے کہے کہ جج صاحب کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کر دے۔ وہ مکان سے باہر نکلا اور وہاں ڈھاٹا باندھے ہوئے چار آدمی اس کے پاس آئے۔ دو کے پاس جلتی ہوئی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتو کھ سے پوچھا۔ "کیوں سردار جی اپنا کام کر آئے؟"

سنتو کھ نے سر ہلا کر جواب دیا "ہاں کر آیا"

اس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا "تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا"

"ہاں ——— جیسی تمہاری مرضی" یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

منٹو کے افسانے کا یہ اختتام ہر چند قاری کے لئے غیر متوقع ہے لیکن اس میں تصنع نہیں ہے ——— چونکہ ہم عام طور پر ایک فارمولا کے مطابق بنائے ہوئے اختتام کے عادی ہو گئے اس لئے شاید لوگوں کو اس کی توقع نہ ہو گی۔ منٹو واقعات کو توڑنے مروڑنے کا عادی نہیں ہے اور جہاں وہ ایسا کرتا بھی ہے

تو جلدی سنبھل جاتاہے۔ جیساکہ " ۱۹۱۹ء کی بات " میں۔ اس افسانے میں "جلیان والا باغ" کے المیے کی ایک کہانی ہے جس میں دو طوائف بہنوں کا بدمعاش بھائی تھیلا آزادی کی اس لڑائی میں شامل ہوگیا اور انگریزوں کی گولی سے شہید ہوگیا۔ اس کی قیمہ قیمہ لاش دیکھ کر محلے برادری کے لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، اس کی طوائف بہنیں الماس اور شمشاد بے ہوش ہوگئیں۔

اور اس سانحے کے بعد جب اس کی بہنوں کے حسن و جمال کا ذکر کسی نے فوجی افسر سے کر دیا۔ طے ہوا کہ انھیں بلوایا جائے ——— حکم حاکم مرگ مفاجات وہ پہنچیں اور دستور کے مطابق بن کر سنور کر۔ پھر شراب کے دور چلے، وہ ناچتی گاتی رہیں ——— پھر دو بجے محفل برخاست ہوئی تو ———

" انھوں نے اپنی زرق برق پشوازیں نوچ ڈالیں اور الف ننگی ہوگئیں اور کہنے لگیں لو دیکھو ——— ہم تھیلے کی بہنیں ہیں ——— اس شہید کی جس کے خوبصورت جسم کو تم نے صرف اس لئے گولیوں سے چھلنی کیا تھا کہ اس میں وطن سے محبت کرنے والی روح تھی ——— ہم اسی کی خوبصورت بہنیں ہیں ——— آؤ اپنی شہوت کے گرم گرم لوہے سے ہمارے خوشبوؤں میں بسے ہوئے جسم داغ دار کر دو ——— مگر ایسا کرنے سے پہلے ہمیں ایک بار اپنے منہ پر تھوک لینے دو۔"

اور پھر داستان گو آنسو بھر کر کہتا ہے کہ " ان کو گولی سے اڑا دیا گیا۔"

یہ کہانی کا پہلا اختتام تھا۔ اس میں وہ تمام ڈرامائیت موجود ہے جو افسانے کو ایک خوش گوار انجام تک پہنچاتی ہے لیکن منٹو تو اس انجام سے واقف ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والے کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لئے کہانی نہیں لکھ رہا۔ اس لئے وہ داستان گو سے کہتا ہے ——— " اس کا انجام مجھے آپ کا خود ساختہ معلوم ہوتا ہے۔"

اس نے کہا " آپ نے کیسے جانا؟"

میرے ہم عصر (داستان گو) نے اپنے حلق کی تلخی تھوک کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا ——— جی ہاں ——— ان حرام ——— وہ گالیاں دیتے دیتے رک گیا " انھوں نے اپنے شہید بھائی کے نام پر بٹہ لگا دیا " یہ کہہ کر وہ پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ گویا حقیقی کہانی اس طرح ختم ہوتی ہے۔

یہ انداز منٹو کا اپنا فن ہے جہاں وہ منفرد ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنے قاری کا پورا پورا اعتماد حاصل کر لیتا ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ منٹو اسے خوش کرنے کے لئے کوئی بات غلط نہیں کہے گا۔ منٹو اپنے افسانے کے مواد کو اپنے کہانی کہنے کے ڈھنگ میں مکمل طور پر ہم آہنگ کر لیتا ہے اور مواد اس کی تکنیک کے فریم میں اچھی طرح جم جاتا ہے اور اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن کو دھکا نہیں لگتا۔

منٹو کہانی کہنا جانتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ سننے والے کا ہنکاری بھرنا بھی ضروری ہے اور اس کے لئے وہ کہانی کہتا جاتا ہے اور اسے اس دوران میں ہنکاری کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ منٹو جس طرح کہانی تیار کرتا ہے اسی طرح اپنی تکنیک پر بھی خاطر خواہ توجہ دیتا ہے ـــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہانی کہنے کے فن سے بخوبی واقف ہے۔ وہ معمولی سے معمولی واقعے کو بڑی آسانی سے کہانی کا روپ دے سکتا ہے۔ اسی میں اس کی زود نویسی کا راز پنہاں ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں :

"منٹو کو ایک قصہ گو کی حیثیت سے کئی گر کی باتیں معلوم تھیں اور قصہ گوئی کے ساتھ اس کے فطری میلان اور فن کے ساتھ اس کے بے پایاں لگاؤ نے اس میں ان گر کی باتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی عادت پیدا کر دی تھی۔ منٹو کو علم تھا کہ زندگی میں ہر قدم پر ایک کہانی ہے۔ ہر انسان اور ہر واقعہ خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت اور کیسا معمولی کیوں نہ ہو کہانی کا بڑا اور دل چسپ موضوع ہے :

منٹو کی معمولی کہانیاں بھی فنی اعتبار سے کسی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان میں کہیں ڈھیلا ڈھالا پن نہیں ہوتا۔ وہ قاری کی دل چسپی کو برقرار رکھتا ہے اور یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ کون سی بات کہاں کہنا چاہئے۔ وہ اپنے کرداروں کو خوب اچھی طرح پہلے سے سمجھ لیتا ہے اسی لئے اسے کہانی کے اندر ان کے ساتھ رسہ کشی نہیں کرنا پڑتی۔ اس کے کردار نیچرل ہوتے ہیں۔ ان میں کہیں تصنع نہیں ہوتا۔ ممد بھائی منٹو کا جانا پہچانا کردار ہے۔ منٹو اس کی کردار نگاری میں ذرا بھی ذہن پر زور نہیں ڈالتا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے اس کو پیش کر دیا ہے۔ ایسے کردار کوئی عجوبہ نہیں ہوتے جو دوسروں کے کام آتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا تیج و خم دلچسپ ہوتا ہے۔ یہ کہانی اردو ادب میں اپنے انجام کی وجہ سے زندہ رہے گی۔ ممد بھائی کا مونچھیں کٹوانا اور پھر اس پر تاسف کرنا، یہی اس کردار میں جان ڈالتا ہے۔

منٹو کے افسانے بندھے ٹکے نظریات کی پابندی نہیں کرتے۔ وہ ہر جگہ سماج کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہراتا بلکہ اس کے سامنے افراد بھی سماج کو بگاڑنے میں مدد کرتے ہیں۔ فرد تنہا بھی بہت کچھ ہے۔ وہ بغاوت کر کے ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے تو پھر جہاں بغاوت کی ضرورت ہے وہ وہاں تماشائی کے طور پر کھڑا ہو جائے تو منٹو اسے معاف نہیں کرتا۔ بعض اوقات سماج کی برائیاں اتنی رچ بس جاتی ہیں کہ فرد کے لئے ان سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی ہی صورت حال افسانے "دو قومیں" میں پیش آتی ہے۔ شاردا اور مختار ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے سے پیمان وفا باندھتے ہیں لیکن جب شادی کی بات آتی ہے تو شاردا پوچھتی ہے ——— "کیسے ہو سکتی ہے ہماری شادی؟"

مختار مسکراتا ہے "اس میں مشکل ہی کیا ہے۔ تم مسلمان ہو جانا"

شاردا ایک دم چونکی "مسلمان!"

مختار نے اطمینان سے کہا "ہاں ——— ہاں ——— اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے ——— مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر والے بڑا ہنگامہ مچائیں گے لیکن میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے غائب ہو جائیں گے ——— سیدھے کلکتہ چلیں گے۔ باقی کام اباجی کے سپرد ہے۔ جس روز وہاں پہنچیں گے اسی روز مولوی بلا کر تمہیں مسلمان بنا دیں گے۔ شادی بھی اسی وقت ہو جائے گی۔

شاردا کے ہونٹ شاید کسی نے سی دیئے۔ مختار نے اس کی طرف دیکھا "خاموش کیوں ہو گئیں؟"

شاردا نہ بولی، مختار کو بڑی الجھن ہوئی "بتاؤ شاردا کیا بات ہے؟"

شاردا نے بمشکل اتنا کہا "تم ہندو ہو جاؤ"

"میں ہندو ہو جاؤں" مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ ہنسا "میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں؟"

"میں مسلمان کیسے ہو سکتی ہوں؟" شاردا کی آواز مدھم تھی۔

پھر مختار اپنے مذہب کی تعریف اور ہندو مذہب کی برائی کرتا ہے اور شاردا کہتی ہے "نہیں نہیں جائیے آپ جلدی جائیے ——— وہ آجائیں گے ———" شاردا کے لہجے میں بے اعتنائی کی سردی تھی۔

"جاؤ ــــ چلے جاؤ ـــــــ ہمارا ہندو مذہب بہت برا ہے۔ تم مسلمان بہت اچھے ہو ــــ"
شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مختار اپنا اسلام دبائے وہاں سے چلا گیا۔

آخری جملہ بڑا تیکھا اور تیز ہے۔ لیکن منٹو نے یہاں کوئی تقریر نہیں کی اور قاری کے سوچنے کے لئے بہت کچھ چھوڑ دیا۔

منٹو نے فسادات پر بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس کو ان کہانیوں کے اندر فساد کے پیچھے کوئی سامراجی ہاتھ نظر نہیں آتا اور یہ بھی سچ ہے کہ منٹو نے اپنے یہ افسانے ترازو سے تول تول کر نہیں لکھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا حساب برابر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو نے فسادیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ اپنے افسانے "سہائے" کی شروعات اسی طرح کرتا ہے:

> "یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ـــــ یہ کہو دو لاکھ انسان مرے ـــــ اور یہ بھی اتنی ٹریجیڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے۔ ٹریجیڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بیوقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوق سے مذہب شکار کئے جا سکتے ہیں۔
> مذہب، دین، دھرم، یقین، عقیدت ـــــ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟"

منٹو نے فساد پر جو کچھ لکھا ہے اس میں اس کا عکس جھلکتا ہے۔ منٹو کے "سیاہ حاشیے" پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے محمد حسن عسکری نے لکھا تھا "یہ افسانے فسادات کے متعلق نہیں ہیں، انسان کے بارے

میں ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں آپ انسانوں کو مختلف شکلوں میں دیکھتے رہے۔ انسان بحیثیت طوائف کے انسان بحیثیت تماش بین کے وغیرہ وغیرہ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں انسان کو ظالم یا مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور فسادات کے مخصوص حالات میں سماجی مقصد کا تو منٹو نے جھگڑا ہی نہیں پالا:

میں عسکری صاحب کی رائے سے جزوی طور پر اختلاف کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ سماجی مقصد اوپر سے لادا نہیں جاتا یعنی اس کا برش اوپر سے نہیں پھیرا جاتا کہ وہ صاف صاف نظر آئے۔ فن کے بارے میں یہ بات جب کہی گئی کہ فن، فن کو چھپانے کا نام نہیں ہے تو دراصل یہی بات پیش نظر رہی ہوگی ـــــ منٹو یقیناً کسی سماجی مقصد کا ڈھنڈورچی نہیں ہے لیکن وہ اپنے آپ کو سماج سے بالاتر بھی نہیں سمجھتا۔ سماج اس کی کہانیوں میں ہوا کی طرح نظر نہیں آتا، لیکن وہ اس کے ہر افسانے میں موجود ہے۔ منٹو اس معاشرے کا بہت بڑا نقاد ہے۔ اس کے افسانے بقول حسن عسکری اخلاقی طور پر ہمیں چونکاتے ہیں۔ یہاں میں اس سے غرض نہیں کہ افسانہ نگار کا لکھنے کا مقصد کیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ منٹو ان واقعات سے قطعاً بے تعلق نہیں جو اس کے افسانوں میں پیش آرہے ہیں اور جہاں ظالم اور مظلوم کا معاملہ ہے وہاں صاف طور پر منٹو ظالم کے ساتھ نہیں، مظلوم کے ساتھ ہے۔

منٹو نے ایک مباحثے کے دوران کہا تھا کہ ایک تاثر کا، خواہ کسی کا ہو، اپنے اوپر مسلط کر کے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے، یہ افسانہ ہے ـــــ منٹو نے یہی عمل اپنے افسانوں اور اپنے کرداروں کے ساتھ کیے۔ ان کا گرشت پوست کا محسوس ہونے کا بھی یہی سبب ہے۔ منٹو اپنے غیر حقیقی کرداروں کو بھی حقیقی تصور کر لیتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ افسانہ لکھنے کے دوران اس کو خود بھی یقین ہو جاتا ہوگا کہ وہ اس کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ چلتے پھرتے انسان تھے۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ جس ماحول اور فضا کو پیش کرتا ہے اس سے وہ خوب اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے نہ صرف اس فضا کو اپنے تصور میں دیکھا ہے بلکہ اس فضا میں اس نے سانس لیا ہے، گھوما پھرا ہے۔ وہ اس ماحول سے اس طرح آشنا ہے کہ جیسے اس نے ساری زندگی وہیں گذاری ہے۔ اسی لئے وہ اپنے پڑھنے والے کا اعتماد بہت جلد حاصل کر لیتا ہے۔ اس کا قاری سمجھ جاتا ہے کہ اسے دھوکا نہیں دیا جا رہا ہے۔ منٹو افسانہ نگار ہے ـــــ مصلح قوم

نہیں ـــــ اس لئے اس کے یہاں اس ماحول کو سدھارنے کا جذبہ نہیں ہے۔ شاید اسی لئے بہتوں کو ان سے شکایت بھی ہے۔ ہمارے ادیب اور فن کار سے لوگ بہت سے کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ قلم سے ضرورت پڑنے پر تلوار کا کام بھی لے اور یہیں منٹو انھیں مایوس کرتا ہے۔ منٹو سے پہلے جب ہمارا دانشور طوائف کے کوٹھے پر جاتا تھا تو اس سے یہ پوچھتا تھا کہ تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا اور اس کو پہلے سے اس کا جواب معلوم ہوتا تھا کیوں کہ اس نے معاشیات کی کتابیں پڑھی تھیں ـــــ عمرانیات کا بھرپور مطالعہ کیا تھا ـــــ چنانچہ وہ اس طوائف کے لئے شوہر تلاش کرتا یا خود اپنی خدمات پیش کر دیتا۔ منٹو نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ کیوں کہ وہ سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن تصنع اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ اس کو اس سے ہرگز دلچسپی نہیں کہ وہ پیشہ کیوں کرتی ہیں، اپنا جسم کیوں بیچتی ہیں ـــــ وہ خود بھی تو خریدار کے طور پر وہاں پہنچتا ہے ـــــ منٹو عصمت سے جھنجھلا کر کہتا ہے "میں آج منوا کر رہوں گا میں رنڈی بازار" اور صفیہ سے گواہی دلواتا ہے۔ جب عصمت کو یقین نہیں آتا تو کہتا ہے "چلو رنڈی کے یہاں ابھی، اسی وقت آج قائل نہ کر دوں تو میں نے ماں کا دودھ نہیں، سور کا دودھ پیا ہے" ـــــ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے یہاں کوئی ملاوٹ نہیں ہے جیسی "کھول دو" کے رضا کاروں کے یہاں ہے۔ جو خدمت کے پردے میں سب کچھ کرتے ہیں۔ جسے صحیح معنوں میں ہوس پرستی کہا گیا ہے اور جب منٹو ان کا پردہ چاک کرتا ہے تو عدالتوں میں جا کر پناہ لیتے ہیں۔

منٹو کے پاس ان سب کا جواب اور ان کا جواز زندگی کے اس تجربے میں ہے جو ان کا اپنا ہے۔ اسی وسیع تجربے نے ان میں خود اعتمادی پیدا کی ہے کہ وہ ہر تجربے کو افسانے کی شکل میں ڈھال سکتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ افسانے کی تکنیک پر پورے طور پر حاوی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ منٹو کے یہاں ہیجان ہے لیکن کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جس زندگی کو وہ پیش کرتا ہے اس میں خود ہیجان ہے۔

"سوکینڈل پاور کا بلب" کا مرد جب طوائف کے پاس جاتا ہے تو اس عورت سے ہر طرح کے سوالات کرنا چاہتا ہے، اس سے ہم دردی کرنا چاہتا ہے۔ وہ عورت جس کی آنکھوں میں نیندیں بھری پڑی ہیں برسوں کی راتوں کی ـــــ اور جو دلال کے حکم سے زبردستی اس کے پاس آئی ہے۔ اس وقت وہ عورت آپے سے باہر

ہے اس مرد کی ساری باتیں اس کے لئے غیر متعلق ہیں۔ وہ تنگ آ کر کہتی ہے "مجھے نہیں چاہئے کوئی ہمدردی نہیں" اور پھر قریب قریب چیخ پڑتی ہے "تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو"۔

ایسی فضا میں کوئی کیسے ہیجان سے پہلو تہی کر سکتا ہے۔ جس معاشرے میں جنس کی حیثیت ایسے بکنے والی شے کی سی ہو، جہاں ہر طرف ظلم ایذا دہی، قتل و خون کا دور دورہ ہو وہاں ایک افسانہ نگار سے یہ توقع کرنا کہ وہ ایک دھیمی اور خاموش فضا میں محض تحلیل نفسی کرے گا یہ افسانے کے ساتھ انصاف ہے اور نہ افسانہ نگار کے ساتھ۔

منٹو سماج کا بے رحم نقاد ہے اور سماج کے ساتھ اگر کہیں سیاست بھی اس زد میں آجاتی ہے تو وہ اسے بھی نہیں بخشتا۔ ہنگامی موضوعات پر منٹو نے زندہ رہنے والے افسانے لکھے ہیں۔ جن میں ۱۹۱۹ء کی ایک بات"، "نیا قانون" اور فسادات سے متعلق اس کے بیشتر افسانے شامل ہیں۔ "نیا قانون" ۱۹۳۷ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے متعلق کہانی ہے جس میں یہ ایکٹ پس منظر کا کام کرتا ہے۔ یہ ایک کوچوان استار سنگھ کی ذہنی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ کردار پس منظر کا ہے اور پورے معاشرے کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے جہاں تنکے کا سہارا بھی کچھ کم نہیں معلوم ہوتا اور یہ تنکا بھی ہاتھ نہیں آتا۔ ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہندوستان کی معاشی بدحالی کا بدترین زمانہ تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں تحریک آزادی کو نئے موڑ سے گذرنا پڑا اور شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک کوچوان میں جرأت پیدا ہوئی اور وہ نیا قانون کے نام پر ایک انگریز پر ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ بلاشبہ یہ منٹو کے بہترین افسانوں میں سے ہے۔ منٹو کے قلم نے ۱۹۵۵ء تک بہت دور کا سفر کیا لیکن "نیا قانون" ایک مینارۂ نور کی طرح برابر دکھائی دیتا رہا۔

منٹو کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقتاً "عورت" کا افسانہ نگار ہے۔ عورتوں کے لئے منٹو کے دل میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ جیسا کہ عام خیال ہے۔ منٹو عورت کے صرف جنسی پہلو کو دیکھتا ہے۔ یہ منٹو کو نہ سمجھنے کی بنا پر ہے۔ منٹو کی عورتیں ہی منٹو کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں۔ وہ چاہے زینت ہو یا جانکی، موذیل ہو یا برمی عورت، ممی ہو یا نیلم ـــــ اس کے نزدیک عورت کا سب سے مقدس لمحہ وہ ہوتا ہے جب اس کے اندر ماں کی ممتا جاگتی ہے اور یہیں ہمیں منٹو کا اصل روپ نظر آتا ہے۔ شاردا نذیر سے بے تعلق رہتی ہے،

اس سے چڑھتی ہے لیکن جس وقت نذیر اس کے اندر کی ماں کو چھوتا ہے تو وہ عورت نذیر کو کبھی پیار بھری نظر سے دیکھتی ہے۔ جب اس کے بچے کو دیکھ کر نذیر کہتا ہے کہ اس کی ماں تو میں ہوں تو وہ اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ ابھی اسی عورت نے نذیر کو پیار کرنے کی وجہ سے زمین پر تین بار حقارت سے تھوکا تھا۔ غصے میں غالباً گالیاں دینے والی تھی کہ اس کے بچے کے رونے کی آواز آئی اور شاردا ماں بن گئی اور جب نذیر پوچھتا ہے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں تو وہ ماں بن کر کہتی ہے "منی رو رہی ہے، دودھ کے لئے"۔ پھر جب نذیر بچے کے لئے دکس کی گولیاں منگواتا ہے تو وہ نذیر کی ہو جاتی ہے ـــــ اس کہانی کو لکھتے وقت منٹو کہانی میں اتنا کھو جاتا ہے کہ بار بار نذیر کی جگہ خود پوز کرنے لگتا ہے۔ یہ نذیر نہیں بلکہ منٹو کہہ رہا ہے کہ "یہ دودھ ـــــ ماں بننا اچھا ہے۔ مردوں کی کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورت کھاتی بھی ہے اور کھلاتی بھی ہے۔ اپنے بچے کو پالنا کتنی شاندار چیز ہے۔ یہ دودھ، یہ سفید آب حیات ہے"۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ منٹو کو نذیر سے کوئی ہمدردی نہیں۔ نذیر محض ایک عیاش مرد ہے۔ وہ شاردا کی محبت کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ حالانکہ خارجی اسباب اس کے لئے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے قطرے چھٹ گئے تھے اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔

اس افسانے میں منٹو نے مرد اور عورت کا تضاد بھی پیش کیا ہے جہاں عورت ایک گھریلو زندگی پر جان دیتی ہے، مرد کے لئے ماں بن جاتی ہے۔ اس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتی ہے۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لئے سوئٹر بنتی ہے۔ صبح صبح اس کے لئے شیو کا سامان تیار کرتی ہے۔ سارے گھر کی صفائی کرتی ہے لیکن نذیر ایک ہوس پرست مرد کا کردار ہے۔ جب وہ شاردا کے ساتھ اپنے گھر میں بستر پر لیٹتا ہے اور شاردا کو اپنے گلے سے لگاتا ہے "شاردا صاف تھی، وہ خود صاف تھا۔ کمرے کی فضا بھی صاف تھی، لیکن کیا وجہ تھی کہ نذیر کے دل و دماغ پر طاری نہیں ہوئی تھی جو اس نفیس ہوٹل میں، لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔ اور جب نذیر فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا

کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنی بیوی کے پاس۔ مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے اور اس کی بیوی لاہور میں، تو وہ دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے وہ دس روپے کرائے کے دے، کریم کو پاس روپے دے اور چلا جائے۔"

نذیر کو اپنے گھر کے صاف ستھرے ماحول سے تشفی نہیں ہوئی جو ہوٹل کی فلاظت اور احساس گناہ میں تھی اور بالآخر جب شاردا اپنے مادرانہ جذبے کا اظہار نذیر کے مکان میں نہیں کر پاتی تو چپ چاپ اپنی بیٹی کے پاس چلی جاتی ہے کیوں کہ وہیں اس کی ممتا کو تسکین ہوگی۔

یہی جذبہ "ہتک" کی سوگندھی کے ہاں نظر آتا ہے۔ اس کے جسم سے لطف لینے والے جب ریاکاری سے کہتے "سوگندھی! میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔ پریم کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کو پگھلا کر اپنے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مسام میں رچ جائے یا وہ خود اس کے اندر چلی جائے، سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اپنی گود میں سلا دے۔

یہ سوگندھی طوائف تھی۔ منٹو کی بے چین روح اس طوائف کے اندر داخل ہو جاتی ہے اور سوگندھی اپنے آپ سے کہتی ہے: "سوگندھی! تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"سڑک کے کنارے" منٹو کا ایک معرکۃ الآرا افسانہ ہے۔ باوجود یکہ یہی کتاب کا نام بھی ہے جس میں یہ افسانہ شامل ہے لیکن اس افسانے پر نقادوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ البتہ ممتاز شیریں نے اس افسانے کا ایک سے زیادہ بار ذکر کیا ہے۔ یہ افسانہ زندگی کا سیدھا سادا سچا افسانہ ہے جس میں کوئی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ منٹو نے زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بڑی بے رحمانہ صداقت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہاں کوئی خاص کردار نہیں ہے۔ ایک عورت ہے

اور ایک مرد ـــــ ان کا کوئی نام بھی نہیں ہے ۔ نہ یہ گھر اور سڑک کسی مخصوص علاقے سے وابستہ ہے ۔ یہاں کوئی بھی عورت ہو سکتی ہے اور کوئی بھی مرد ـــــ جہاں ایک ازلی گناہ سرزد ہوتا ہے جسے منٹو دو روحوں کا ملاپ کہتا ہے ۔ جس کے ذمے دار دونوں ہیں لیکن وہ مرد، جس کی نیلی آنکھوں کو منٹو آسمان کی نیلاہٹ سے تشبیہہ دیتا ہے، وہ بے نیاز ہو کر اپنا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے اور عورت جو ماں کا مظہر ہے، اس کے پیٹ میں ماں کا پیار پلتا ہے، جو اس کے اپنے جسم کا ایک ٹکڑا ہونے کے ساتھ ایک گ.. کر نشانی بھی ہے ۔ اور وہ عورت اپنے آپ سے پوچھتی ہے

اس کائنات میں ایک روح کبھی کبھی کیوں گھائل چھوڑ دی جاتی ہے ۔

کیا اس تصور پر کہ اس نے دوسری روح کو اس ننھے سے نکتے پر پہنچنے میں مدد کی تھی ۔

ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا ـــــ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے ـــــ کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے ۔

یہ میرے اندر دہکتے ہوتے چولھوں پر کس مہمان کے لئے دودھ گرم کیا جا رہا ہے ـــــ

یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے ۔

میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں کی ایسی تقدیس کیوں آ رہی ہے ۔

یہ کس کا آنسو میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے ۔ یہ کہاں بندھے گا ۔

اس تخلیقی عمل میں نہ صرف یہ کہ تخلیق کا کرب شامل ہے بلکہ ایک معاشرہ کا جبر ہے جو اس عورت کو تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی دکھاتا ہے :

" انگلیاں اٹھیں گی ـــــ جب سیپ کا منھ کھلے گا اور موتی پھسل کر باہر جو پڑا ہے پر گر پڑے گا تو انگلیاں اٹھیں گی ۔ سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی ـــــ اور یہ انگلیاں سنپولیاں بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی ۔

اور پھر جب ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے تو عورت کے اندر ماں تڑپ جاتی ہے ۔ اسے کوئی سلا نہیں سکتا ۔ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز ہو جاتی ہے، چیخنے لگتی ہے ۔

میں گود بھر رہی ہوں ـــــ میری باہیں کھل رہی ہیں ـــــ چولھوں پر دودھ ابل رہا ہے میرے سینے کی گولائیاں پیالہ بن رہی ہیں ـــــ لاؤ اس گوشت کے ٹکڑے کو ـــــ میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں پر لٹا دو۔

"مت چھینو ـــ مت چھینو ـــ"

"انگلیاں ـــ اُٹھتی دو انگلیاں مجھے کوئی پرواہ نہیں ـــ یہ دنیا چوراہا ہے۔ پھوٹنے دو میری زندگی کے تمام بھانڈے ـــ میرا گوشت واپس دے دو" اور بالآخر اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔

افسانہ پڑھتے پڑھتے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ منٹو ہمیں اس کے منطقی انجام پر کس طرح لے جاتے ہیں۔ اور منٹو نے اس افسانے میں اپنے بڑے افسانہ نگار ہونے کا صاف پتہ دیا ہے۔ افسانے کا اختتام اخبار کی سیدھی سادی خبر سے ہوتا ہے:

"لاہور ۲۱ جنوری ـــ دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرے، گٹر کے کنارے پڑی ہوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی سنگ دل نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے۔ مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔"

اخبار کی یہ خبر جس بے نیازی اور بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے اس سے افسانے کے تاثر میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی زبان بظاہر کتنی سپاٹ ہے۔ منٹو الفاظ کو بہت احتیاط سے استعمال کرتا ہے۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ شاید منٹو سے ذرا نیچی سطح کا افسانہ نگار یہاں محض بچہ لکھ کر بات پوری کر دیتا۔ لیکن منٹو نے اس معاشرے کو ایک بدی کا چکر بنا دیا ہے جہاں پھر ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے، اس حلقے میں شامل ہونے کے لئے جس کا چکر شاید کبھی ختم نہ ہو۔

منٹو کا یہ افسانہ اپنے موضوع ـــ اس موضوع کو فنی ہیئت دینے کے سلسلے میں ـــ اس کی تکنیک کے اعتبار سے بے حد مکمل ہے۔ ممتاز شیریں نے اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑے نکتے کی

بات کہی ہے :

"یہاں منٹو کا جنس کا تصور کتنا مختلف ہے، اور کتنا بلند ہے۔ مگر منٹو کا نظریہ جنس کے متعلق ہمیشہ صحت مند رہا ہے اور وہ اسے ایک ازلی فطری صحت مند جذبہ سمجھ رہا ہے۔ لیکن پہلے منٹو کا جنس کا تصور محض جسمانی تھا لیکن یہاں منٹو کا یہ تصور اتنا بلند ہو چکا ہے کہ اسے اپنے وجود کی تکمیل اور روح کے ملاپ سے تعبیر کیا ہے۔"

اس افسانے میں اپنے اور افسانوں کی طرح منٹو نے اسباب کی طرف نہیں بلکہ اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

منٹو کے یہاں اگر عورت ماں نہیں بنتی یا کسی سبب سے بننا نہیں چاہتی جیسا کہ جانکی مجبوری کے بارے میں منٹو سے کہتی ہے ـــــ "پسند ہیں ـــــ لیکن کون پالتا پھرے"۔

تاہم یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ماتا کا یہ مقدس جذبہ عزیز اور سعید کے پیار میں منتقل ہو گیا ہے جانکی کے ان دونوں سے جنسی تعلقات ہیں لیکن وہ ان کا اسی طرح خیال رکھتی ہے جیسے ماں اپنے بچے کا خیال رکھتی ہے۔ وہ ایک مرد سے تسکین حاصل نہیں کرتی۔ اس لئے نہیں کہ اس کے اندر جنسی جذبے کی شدت ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی ماتا کو اپنے اظہار کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے۔ وہ چیخوف کے "ڈارلنگ" کی طرح ہر بار اپنے خلاء کو پر کر لیتی ہے۔

منٹو کا قلم طوالت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ جہاں افسانہ طویل ہوا ایسا لگتا ہے کہ اس کے قابو سے نکلتا جاتا ہے۔ اس کے کامیاب ترین افسانے اس کے مختصر ترین افسانے ہیں۔ یہاں کھول دو ٹھنڈا گوشت، ٹوبہ ٹیک سنگھ، بو، نیا قانون وغیرہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔

"ممی" کی طوالت منٹو کے فن کو اس افسانے میں مجروح کرتی ہے لیکن وہ "سعیدہ کاٹج" کی اس پوری فضا کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے مجبور ہوا کہ ہر کردار کے ساتھ انصاف ہو لیکن اگر اور کرداروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتا جو اس نے شیریں کے ساتھ کیا تو اس کا تاثر اور بھی بڑھ جاتا عام طور پر جہاں کہیں بھی منٹو نے افسانے کو طول دینے کی کوشش کی فن کی گرفت ڈھیلی ہو

میں نے اس مجموعے کے لئے افسانوں کا انتخاب کرتے ہوئے دراصل منٹو کا ایک ہمدردانہ مطالعہ کیا ہے۔ ناقد کی نظر سے نہیں بلکہ قاری کے ذہن سے۔ اس عمل میں میں نے منٹو کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ اس کے کرداروں کے درمیان میں کبھی کبھار بھٹکا ہوں۔ اس لئے ان افسانوں کے ساتھ مجھے ذرا سا جذباتی لگاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ میں اسے بری بات نہیں سمجھتا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی منٹو کو اسی شوق کے ساتھ پڑھیں۔ اس کے کرداروں کے درمیان سانس لیں۔ ادب سے لطف اندوز ہونے کا صحیح معنوں میں طریقہ بھی یہی ہے۔ اس طرح ہمیں ان افسانوں میں حقیقت بھی نظر آئے گی اور وہ تخلیقی کرب بھی جس سے منٹو گزرا ہے اور وہ خلوص بھی جو منٹو کے لئے مخصوص تھا۔ منٹو اپنی زندگی میں صرف ایک بار مرا ہے لیکن ان افسانوں میں وہ بار بار مرا اور بار بار جی اٹھا ہے۔ مجھے کئی بار یوں ہی خیال ہوا کہ منٹو پھر قبر سے اٹھ کھڑا ہو گا اور سیدھا صفیہ کے پاس جائے گا اور کہے گا 'لو میں آگیا' اور اسی طرح اکڑوں بیٹھ کر افسانہ لکھنے لگے گا۔

منٹو، دراصل بات یہ ہے کہ 'افسانے کے سخن' سے خوگر تھا۔ اسی لئے اس کے افسانوں میں آپ کو روانی ملتی ہے۔ وہ کہیں نہیں اٹکتا۔ مجھے اس کے افسانے پڑھ کر بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ منٹو نے ہر افسانہ ایک نشست میں لکھا ہو گا۔ اس کے افسانوں میں ایک تسلسل ہے جو کہیں نہیں ٹوٹتا۔

اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ قارئین یہ ضرور کہیں گے کہ اس میں فلاں افسانہ اور ہوتا تو اچھا ہوتا۔ بہتوں کو کئی افسانوں کی عدم شمولیت کا ملال بھی ہو گا۔ یہ ملال مجھے بھی ہے لیکن مجھے اس میں شبہ نہیں کہ یہ افسانہ اس مجموعہ میں ہوتا تو اچھا تھا تاہم یہ مسئلہ میں پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔ ان چند سطور کے لکھنے سے میرا مقصد منٹو پر ایک مقالہ لکھنا نہیں بلکہ ان افسانوں کے مطالعہ کے لئے ایک فضا قائم کرنا ہے۔ کاش کہ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اس عمل میں میرے بعض دوستوں اور شاگردوں نے میری مختلف طریقوں سے مدد کی ہے۔ میں ان کا شکر گذار ہوں۔ ایک غیر ملکی سفر پر جا رہا ہوں اس لئے پیش لفظ میں شاید عجلت کے آثار بھی نظر آرہے ہوں۔ اس کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔

# نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین میں جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ "ولایت میں اور کہاں؟" اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پہ سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں دبا کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کسی پیر کی بد دعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو اور چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بد دعا دی تھی۔ جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ـــــ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی "یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا۔ اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بد دعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال بھبھوں بھرے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ

رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈّے میں آکر ہل مار کے سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

"..........."۔ یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں ..." اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی .... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے ـــــ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا۔ جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملاعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے ..." یہ کہتے کہتے تھوڑی دیر کے لئے وہ خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اس کو پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین نافذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

وہ مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے بارے میں آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ "سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا ـــــ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟" "ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا، چل ـــــ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی۔ اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا، آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ـــــ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے دلی کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ

اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مار واڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مار واڑیوں کو گالی دی "..... غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ـــــ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔"

وہ بیحد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ـــــ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، بگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر..... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ـــــ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے ..... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں، اسی لئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں وہ "انھیں" "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جب کبھی کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریے کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چوں کہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا۔ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا

"ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعہ کے تیسرے روز گورنمنٹ کالج کے تین طلبا، کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا .....

"نئے آئین نے میری امیدیں اور بڑھا دی ہیں۔ اگر..... صاحب اسمبلی کے

مہینہ ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ــــ!" اور وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا۔ اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ــــ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا۔ مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ــــ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا

چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی۔ اور اس کے گھوڑے کے سر پر سجی ہوئی تھی۔ اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکان کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی ..... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی، ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں"۔ اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے پر پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلباء کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی

بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا

"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا، بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وقتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی ہے۔

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بیقرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی ہے۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب

نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ــــــ

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ــــــ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ــــــ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔ گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔

پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا۔ ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کافی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا۔ اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا ہونٹ بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی۔ گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی۔ اس کا چہرہ ہنس رہا تھا۔ اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا، مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے۔ اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا۔ بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"

"کرایہ پانچ روپیہ ہو گا" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے؟ کیا تم ....."

"پانچ روپے" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا "کیوں جاتے ہو ــــ یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ

دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے بیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا جو گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا

"پہلی اپریل کو بھی دہی اکڑ فوں ..... پہلی اپریل کو بھی دہی اکڑ فوں ـــــ اب ہمارا راج ہے بچہ!"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا

"وہ دن گذر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ـــــ اب نیا قانون ہے میاں ـــــ نیا قانون!"

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے

اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔
"نیا قانون۔ نیا قانون۔ کیا بک رہے ہو ـــــ قانون وہی ہے پرانا!"
اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

# کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: "دس لیف ــــــ ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جب کہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے۔ وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپیہ پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی: "صاحب ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے۔ تو وہ ان سے کہتی: "صاحب تم ایک دم الو کا پٹھا ہے۔ حرام زادہ ہے ــــــ سمجھا" یہ کہتے

وقت وہ اپنے لہجے میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا ابھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں۔ مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے، صرف چھ۔ یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا۔ "بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے"۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا۔ "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک ادھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔ اب تمھاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ"۔ چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا۔ "لاتیے ایک روپیہ دودھ کا"۔ اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے کبھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ـــــ بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا

تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ زنجیر اس لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر جوں ہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا "کیا ہوا؟ ـــ یہ چیخ تمہاری تھی؟"

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا "یہ موا بیخانہ ہے یا کیا ہے ـــ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا۔ میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی۔ پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں!"

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس بیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا اس لئے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالے میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں انبالے آیا۔ جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا

کمبندھ ہوگیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لئے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا۔ دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا، چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعے سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے اور اس کی آمدنی پہلے سے دگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوالیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کرلیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی۔ مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جب کہ خدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا سارا سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش

کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا۔ جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لئے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لئے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی "یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے"۔ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قایم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانے کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خدا بخش سے کہا "کیا بات ہے خدا بخش دو مہینے آج پورے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے۔ پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے"۔ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا

ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں ـــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ...." وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھے۔ جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کئے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرائے میں چلے جاتے تھے۔ پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچے تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو، اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں آئیں تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو انبالے میں۔ یہاں کیا دھرا ہے ـــــ؟ بھئی ہو گا۔ پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا۔ چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی۔ اور کہا "نہیں جان من، انبالہ اب نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی اب سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آکر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔ اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا۔ جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی۔ جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک اور پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں اسے نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ

کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ـــــ نہ جانے کہاں ـــــ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔ کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور کھڑے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے۔ ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے یہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا "دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی "جان من، میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا۔ مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیض بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی

تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیوں کہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا سلطانؔ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیوں کہ اب سامنے پٹڑیوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر

بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے کہا "آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے۔" وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا "تمھیں کیسے معلوم ہوا۔ ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟" اس پر سلطانہ نے کہا "یہ میں نے اس لئے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔" وہ یہ سن کر پھر مسکرایا "تمھیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمھارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا۔ تو میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا "نہیں، میں تمھارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔"

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے۔"

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف و شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیض تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا ـــــ "فرمائیے ....."

شنکر بیٹھا تھا۔ یہ سن کر لیٹ گیا۔ "میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمھیں نے ہے مجھے۔" جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ "میں سمجھا۔ لو اب مجھ سے سنو۔ جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی۔ مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"میں ... میں ... کچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سلطانہ نے بھنّا کر کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ـــــ آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔" شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی۔"

"جھک مارتی ہوں۔"

"میں بھی جھک مارتا ہوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔"

"ہوش کی دوا کرو ـــــ یہ لنگر خانہ نہیں۔"

"اور میں بھی والنٹیر نہیں۔"

سلطانہ یہاں رک گئی۔ اس نے پوچھا۔ "یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔ "الو کے پٹھے۔"

"میں بھی الّو کی پٹھی نہیں۔"

"مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمھارے ساتھ رہتا ہے ضرور الّو کا پٹھا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا "تم ہندو ہو۔ اسی لئے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔"

شنکر مسکرایا "ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ پنڈت مالویہ اور مسٹر جناح اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔"

"جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ــــ بولو رہو گے؟"

"اسی شرط پر جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔"

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی "تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا "میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمھیں میری ضرورت ہو، بلا لینا۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا، جہاں کہ وہ خوشحال تھی۔ تو اس نے کسی اور رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی۔ اس لئے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا "پرانے قلعہ کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انھیں کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔"

"کچھ انھوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے —— پر سلطانہ میں جوان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل اگر شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو —— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ نہ کہیں جا سکتی ہوں، نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آگیا ہے۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ کنگنیاں تھیں، سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟ —— یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا "پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہئے —— خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے۔ اور ہماری بہتری ہی کے لئے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کہ کچھ دیر اور تکلیف برداشت کرنے کے بعد ہم ...."

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا "تم خدا کے لئے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ مارو۔ پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی ایک قمیض پڑی ہے۔ اس کو میں کالا

رنگوالوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لاکر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ ہی کالا رنگوا لیا جائے گا۔ صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو۔ . . . . دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لادو ——— میری کھٹی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا۔" اب تم خواہ مخواہ زور دیئے چلی جا رہی ہو ——— میں کہاں سے لاؤں گا ——— افیم کھانے کے لئے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو۔ مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لادو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

"لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ——— تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔" لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ، میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوتی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لئے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا بھی کام ہوتا تھا۔

یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیوں کہ دھوپ آنگن میں موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو

کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔ اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی تھی۔ مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ـــــ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔"

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو۔ تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ـــــ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لئے نہیں ـــــ چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو۔"

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو ـــــ کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں کچھ اور بھی ہے۔"

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی۔ "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"جو دوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا؟"

"تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ اُن میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں۔"

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا۔ "میں سمجھ گئی ہوں۔"

"تو کہو کیا ارادہ ہے؟"

"تم جیتے میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تم غلط کہتی ہو ـــــ اسی محلے میں تمھیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی۔ جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو ـــــ تمھارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے۔"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا۔ "میرا نام شنکر ہے ـــــ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے۔ نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "شنکر میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر...."

"کہو کہو ـــــ رک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے

پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں ـــــ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سن کر کہا "تم چاہتی ہو کہ میں تمھیں کچھ روپے دے دوں۔ جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا "نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار بنوا دو۔"

شنکر مسکرایا "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمھیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں؟" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا "تم انھیں کیا کرو گے؟ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں، ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو؟"

"لے لو" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کو بعد میں افسوس ہوا۔ مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا۔

ساٹن کی کالی شلوار ہے ـــــ دیکھ لینا، شاید لمبی ہو ـــــ اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا۔ اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں نکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا

ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی وہ انوری کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی دعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے کپڑے اس نے جب پہن لئے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو انوری اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے ـــــ کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا "آج ہی درزی لایا ہے" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں انوری کے کانوں پر پڑیں "یہ بندے تم نے کہاں سے لئے؟"

انوری نے جواب دیا "آج ہی منگوائے ہیں"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

# ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی میونسپل کمیٹی کا داروغۂ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا ـــــ وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت زیادہ خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے۔ اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی تو کچھ اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث

پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے ـــــ دائیں بازو کی بغل میں تسکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے جیل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کو منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پر لپیٹنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی، ہونٹوں کی سرخی، پاؤڈر، کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بیحد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹر وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر مندھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف

کی دیوار کے کونے میں شوخ رنگ کی گنیش جی کی تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بیحد چکنا ہو رہا تھا تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لَو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ یونہی کرتی تھی دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے۔ جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا ــــ " اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے ــــ یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! ــــ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑا تا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے۔ تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے ــــ سوگندھی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے ــــ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا ــــ " سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! ــــ

اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر ـــــ "تیری جان کی قسم مادھو آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں ـــــ سمجھیں ؟ بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان ـــــ اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں"۔

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا: "نیچے سے ان بمبے کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی ٹھیک رہے گی"۔

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔ "جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں نوچ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ کبھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی مرا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ ـــــ ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں! رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا ـــــ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی ـــــ ارے وہ تو ڈرنے لگا! ـــــ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا ـــــ وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ آئے گا ـــــ بولا ـــــ روشنی کرو ـــــ روشنی کرو ـــــ میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا ـــــ بولا لائٹ ـــــ لائٹ! ـــــ

اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ "بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!" اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی ـــــ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی۔ اور کہا تجھے شرم نہیں آتی ہے مردوے!" ـــــ وہ

پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی ـــــ وہ پھر گھبرانے لگا ـــــ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی ـــــ کبھی اندھیرا کبھی اجالا کبھی اجالا کبھی اندھیرا ـــــ ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا ـــــ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے، جو یوں مفت دے گیا ـــــ جمنا تو بالکل اکھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے۔"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے۔ جو اس نے اپنی دو ایک سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی ـــــ "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو ـــــ اگر ڈاڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال کبھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ـــــ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے ـــــ وہ خوش خوش چلا جائے اور تم بھی بچی رہو گی ـــــ ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن ـــــ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ نہایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے۔ اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آجاتے تھے جس پر ایک بچہ ہونے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں ـــــ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گذر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات ـــــ کوئی

کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا۔ مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے ـــــ ایسی تھکن جو انھیں جھنجھوڑ کر ـــــ انھیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے! ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے کتنی مزیدار ہوتی ہے ـــــ وہ بیہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے۔ کتنا آنند دیتی ہے ـــــ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا۔ بس ہوا ہی ہوا اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ کتنا مزا دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں۔ تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گذار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا ـــــ بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے سا گوان کے پلنگ پر ہوتا تھا۔ اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی، ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی

تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا "سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں" اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے ـــــ پریم ـــــ کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے ـــــ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کیے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کرنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی ـــــ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا ـــــ "سوگندھی! تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں۔ اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی، جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے اسے روز مل ہی

جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلّال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپیہ خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلّال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے بتا ہی کیوں نہ دیں! ـــــ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟ ـــــ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟ ـــــ چھی چھی چھی ـــــ دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلالی کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات ـــــ اب ان ساڑھے سات روپلیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ـــــ مجھے عورت چاہیے، پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہیے۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے جچتا ہوں ـــــ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں ـــــ بس یہ دس روپے، جن میں ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے۔ اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ـــــ تو بھی ان کا بجنا سن رہی اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ـــــ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لئے ـــــ یہ دھندا چھوڑ ـــــ میں تجھے خرچ دیا کروں گا ـــــ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ـــــ؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں۔ اور کہا تھا ـــــ سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں

یہاں نہیں رکھنے دوں گا ـــــ اور پانی کا یہ گھڑا ـــــ دیکھا۔ کتنا میلا ہے اور یہ ـــــ یہ چیتھڑے ـــــ یہ چندیاں ـــــ اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک ان کو ـــــ اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ـــــ اور ـــــ

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقعہ دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آسکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ـــــ ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں"۔ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں اس نے سوگندھی کو ـــــ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا۔ اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا "دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی ـــــ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ـــــ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ـــــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔"

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا "تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے۔ ایک چھوٹی کوٹھری بھی دی ہے کبھی تو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی

سے پوچھا تھا "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں"۔۔۔۔ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے ۔۔۔۔ لیکن سوگندھی خوش تھی جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں پر ہی راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی ۔۔۔۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خراب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی ۔۔۔۔ وہ ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کارک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا مر گئی تھی؟"۔۔۔۔ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا تھا "اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا "نہیں"۔۔۔۔ تو رام لعل کی آواز پھر اونچی ہو گئی "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟"۔۔۔۔ بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتار نے

میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ـــــ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن۔ پاؤڈر وؤڈر لگا اور چل میرے ساتھ ـــــ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ـــــ چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔" رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔" تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔

"وہ بات نہیں رام لال ـــــ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں ـــــ بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔" تھوڑی سی ہو تو لا ـــــ ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔" بچی ہوتی تو یہ مرا سر میں درد بھی کیوں ہوتا ـــــ دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آ۔"

رام لال نے جواب دیا۔" نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹل مین آدمی ہیں، وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ـــــ تو کپڑے ویڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے پاس والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت

کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا" بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی، اور گالوں پر سرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی ـــــــ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا" لیجئے وہ گئی ـــــــ بڑی اچھی چھوکری ہے تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے۔" پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا" سوگندھی ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے

اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکاچوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اونہہ" نکلا، پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا....

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس "اونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟ .... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی "پسند نہیں کیا تجھے؟ ــــ اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر ــــ کہاں ہے وہ سیٹھ ــــ تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا ــــ اس کی ....

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لال لال انگارہ "اونہہ" بے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے "او سیٹھ ــــ او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی ــــ بس ایک منٹ کے لئے" پر وہ سیٹھ تھڑی ہے اس کی ذات پر بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پہ پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑھی اور اس کی ریشمی سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے۔ کیوں کہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر "اونہہ اونہہ" کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آگیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا ـــ "میں نے اس موئے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے ـــ میری کیا سب کی یہی عادت ہے ـــ پر ـــ پر ـــ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور ـــ یہ بازار ـــ اور وہ موٹر اور بتی کی چمک"۔ یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حدِ نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے۔ اور موٹر کے انجن کی پھڑپھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا۔ اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گذرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا۔ مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو ـــ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا ـــ کیا یہ درد تھا؟ ـــ ایک لمحے کے لئے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا ـــ یہ کیا تھا؟.... لعنت! یہ تو وہی "اونہہ" تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی ـــ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے

تو یہ کہا تھا:" سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اسے ــــ اسے ــــ صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی ــــ نہیں آئی تو کیا ہوا؟ ــــ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی ــ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی ــــ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ ــــ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ــــ ٹھیک ہے۔ پر سوگندھی ــــ تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا ــــ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے ــــ اونہہ ــــ اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ ــــ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل ــــ اور ــــ یہ منہ اور مسور کی دال ــــ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے ــــ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو ــــ دس روپے اور یہ عورت ــــ خچر کیا بری ہے ....."

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس کے خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کی باہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا، کہ اس سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے ــــ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ــــ صرف ایک بار ــــ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ ــــ سوگندھی ــــ اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور ــــ اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے ــــ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے

اور جب تھک جائے ـــــ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا "تم روتی کیوں ہو؟ تمھیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟" ـــــ آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلا کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ـــــ یہ آواز کہاں سے آئی؟ ـــــ سوگندھی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا ـــــ ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے ـــــ اس کا دل ـــــ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو! ـــــ آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے ـــــ اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑا دھڑ کیوں کرتا تھا ـــــ بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ رک جاتا تھا "رات کٹی گن گن تارے" کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں"۔ ـــــ وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے۔ پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا "یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے

گھور کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ـــــ بڑی ملنسار تھی۔ بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول بیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اڑا تھا۔ بیچارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لئے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیئے تھے ـــــ

"مجھ میں کیا برائی ہے" سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی آخری ہوئی بجری ـــــ ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے ـــــ کوئی ـــــ کوئی ـــــ اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ "سوگندھی! کون کہتا ہے تو بری ہے، جو کچھ برا کہے وہ آپ برا ہے" ـــــ نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ "سوگندھی! تو بہت اچھی ہے!"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی اپنی نگاہوں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس

کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا ـــــ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی ؟ ـــــ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے۔ اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ـــــ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ـــــ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی ؟ ـــــ وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ـــــ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ـــــ کیسے ہو ؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی ـــــ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑاتی ہوئی سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں، جدھر موٹر گئی تھی۔ مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ـــــ اور ـــــ

"نہ آئے ـــــ بلا سے ـــــ میں جان کیوں بیکار ہلکان کروں ـــــ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔ چل سوگندھی گھر چل ـــــ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ـــــ فرسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی۔"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا

دھو کر باہر نکلی ہے جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا ـــــ قدم پھر بوجھل ہو گئے۔ اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے ابھی ابھی اس کی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ـــــ اس سیٹھ نے ـــــ پرماتما کرے ..... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ـــــ اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر ہمیں رہتا ـــــ کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نہ تو؟ ـــــ لے دام دیئے بنا لے جا اسے ـــــ پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ـــــ"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار ـــــ صرف ایک بار ـــــ اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں۔ یہ نہیں یہ کرے ـــــ یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں یوں ـــــ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ـــــ بس صرف ایک چھوٹی سی گالی جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل میں اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔

سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ـــــ صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر اس طرح گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ـــــ وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟ ـــــ کیوں؟"

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا۔ اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی "میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی"

مادھو بڑا سٹپٹایا "انتظار؟ ـــــ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں"

سوگندھی کے بھینچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا ـــــ اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔ اور ..."

مادھو خوش ہو کر بولا "اور میں آگیا ـــــ بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ دل کو دل سے راہ ہے ـــــ تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا "چار بجے کے قریب"

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔" اور میں نے ٹھیک دو بجے سینے میں دیکھا ـــــ جیسے تو پھولوں والی ساڑھی ـــــ ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں ـــــ کیا تھا تیرے ہاتھوں میں! ـــــ ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔" مادھو! تو جنتا کیوں کرتا ہے ـــــ لے یہ تھیلی ـــــ ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟" ـــــ سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا ـــــ کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے! ـــــ بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو ـــــ انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے ـــــ تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے ـــــ ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی۔" مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟ ـــــ جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ـــــ بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے ـــــ جان بچی لاکھوں پائے ـــــ بس بس اب جانے دے ـــــ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا ـــــ کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ـــــ واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقعہ اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔" دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا ـــــ اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو..... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی بڑے

بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں تصویر اتروا تے وقت تصویر اتروانے کا خیال، مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر گویا پکار رہی تھی "ہمارا فوٹو اترے گا! ہمارا فوٹو اترے گا!"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اتروا تے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی ـــــ اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی کی تھی "اس کی ـــــ منشی پالٹی کے اس داروغہ کی..... ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا ـــــ کہتا تھا، ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ـــــ اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ "رانی بھنگن کپڑا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی"

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی۔ جیسے وہ ان پر جا قو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا "ہی ہی ہی۔۔۔"

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف

بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔
زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا ــــ
"مجھے کبھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔"
آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا ــــ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے ــــ یہ تیری بکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے تھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟ ــــ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا۔ اونہہ... پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے.... آج کل زمانہ ہی ایسا ہے، جو عیب چھپائے وہ ہی برا ــــ"
مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا "دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے ــــ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں...."
سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ــ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"
مادھو چکرا گیا۔
سوگندھی نے کہنا شروع کیا "میں بتاتی ہوں ــــ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا ــــ اور دس روپے بھاڑا ہے میرا ــــ اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے۔

باقی رہے ساڑھے سات، رہے نہ ساڑھے سات! ان ساڑھے سات روپلیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا ـــــ تیرا میرا ناطہ ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ مجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری ـــــ پہلے میرے اور تیرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے۔ آج پچاس بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں ـــــ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس مار رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا "یہ چیتھڑے یہ چندیاں ـــــ اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کے باہر پھینک ان کو ...."

مادھو چلایا "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا اگبر و جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں .... کتے، کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دیل ہوں کیا؟ ـــــ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ ـــــ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ ـــــ چور یا گھٹ کترا؟ ـــــ اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ ـــــ بلاؤں پولیس کو؟ ـــــ بول نے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ـــــ"

مادھو سہم گیا "دبے ہوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا "سوگندھی! تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"تیری ماں کا سر ـــــ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا ـــــ بھاگ

یہاں سے ورنہ "۔۔۔۔ سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چیلوں میں منھ رکھے سو رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منھ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی "خبردار!۔۔۔ پڑی رہنے دے وہیں۔۔۔۔ تو جا، تیرے پونا پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ۔۔۔۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ۔۔۔۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ۔۔۔۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے.... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ اِدھر دماغ کو پر کرتی تھی۔ اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پر جانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

# ممّد بھائی

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوراں ہوتے ہیں مگر یہ ریستوراں اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی رنڈیاں بستی ہیں۔

ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ بس آپ بھی سمجھئے کہ بیس برس کے قریب، جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی سے آگے نکل کر "پلے ہاؤس" آتا ہے۔ اُدھر دن بھر ہاؤ ہو رہتی ہے۔ سنیما کے شو دن بھر چلتے رہتے تھے۔ چمپیاں ہوتی تھیں۔ سنیما گھر غالباً چار تھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے سماعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے تھے۔

"آؤ آؤ ـــــ دو آنے میں ـــــ فسٹ کلاس کھیل ـــــ دو آنے میں!"

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجانے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے تھے۔ باہر کرسیوں پر چمپی کرنے والے بیٹھے ہوتے تھے۔ جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنٹفک طریقے پر کی جاتی تھی۔ مالش اچھی چیز ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دن کو اور رات کو ہر وقت انھیں تیل مالش کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل مالشیا بلا سکتے ہیں۔ یوں بھی ساری رات آپ خواہ بمبئی کے کسی کونے

میں ہوں، یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے۔" پی ـــ پی ـــ پی ـــ"

یہ "پی" چمپی کا مخفف ہے۔

فارس روڈ یوں تو ایک سڑک کا نام ہے، لیکن دراصل یہ اس پورے علاقے سے منسوب ہے۔ جہاں بیسوائیں بستی ہیں۔ یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں جن کے مختلف نام ہیں، لیکن سہولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلہ لگی دوکانیں ہیں جن میں مختلف رنگ وسن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف داموں پر آٹھ آنے سے آٹھ روپیہ تک، آٹھ روپے سے سو روپے تک ـــ ہر دام کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔

یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی، جاپانی، غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے ـــ یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں ـــ معاف کیجئے گا، اس کے متعلق آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھئے ـــ بس عورتیں ہوتی ہیں ـــ اور ان کو گاہک مل ہی جاتے ہیں۔

اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں معلوم نہیں یہ کیا کاروبار کرتے ہیں مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو رستوراں چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اوپر نیچے کیڑے مکوڑوں کی شکل میں کچھ لکھا ہوتا ہے ـــ معلوم نہیں کیا ـــ

اس علاقے میں بزنس مین اور ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب سین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس کی میں بات کر رہا ہوں اس گلی میں غالباً بیس پچیس عرب رہتے تھے جو خود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔

اس گلی میں مجھے ایک کمرہ مل گیا تھا جس میں سورج کی روشنی کا داخلہ بند تھا۔ ہر وقت بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔

آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا تو آپ مشکل سے یقین کریں گے کہ وہاں کسی کو کسی اور سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے، مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جائے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اور اس کا نام تھا ممد بھائی۔

ممد بھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی میں آیا تو ہوٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا۔ لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا لیکن مجھے ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا کیوں کہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں کہ بیس پچیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار ساری بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتہ نہیں چلتا۔ سر قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

اس کے ہاتھ کی یہ صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا لیکن یوں اس کے متعلق اور باتیں سن سن کر میرے دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باتیں نہ کروں لیکن قریب سے دیکھ لوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ غریبوں کے دکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی ـــــ صرف گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں

تھیں، ان میں جتنی نادار عورتیں تھیں، سب ممد بھائی کو جانتی تھیں۔ کیوں کہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا اور ان کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پیتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگا تھا جس میں بڑا تندرست ٹٹو جتا ہوتا تھا۔ اس کو وہ خود چلاتا تھا۔ ساتھ ساتھ دو یا تین شاگرد ہوتے تھے، بڑے باادب۔ بھنڈی بازار کا ایک چکر لگا کر یا کسی درگاہ میں ہو کر وہ اس تانگے پر واپس عرب گلی آجاتا تھا اور کسی ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر گتکے اور بنوٹ کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میری کھولی کے ساتھ ہی ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقاص رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ممد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ ممد بھائی کو پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیئے اور ان سے کہا: "دیکھو اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا۔" عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا: "منٹو صاحب! ممد بھائی فرشتہ ہے۔ فرشتہ ـــــ جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کانپنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دو دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

ممد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور واہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص نے جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھکیت سمجھتا تھا مجھ سے یہ کہا تھا کہ ممد دادا اپنے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر ہمیشہ اڑس کے رکھتا ہے جو استرے کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا، کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر وہ باتیں کرتے

ہوئے، جھکتے ہوئے اس سے ذرا سی غلطی ہو جائے تو ممد بھائی کا اک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتیاق دن بہ دن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا۔ بہرحال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام ممد بھائی تھا۔

اس قسم کا آدمی جو ہر کوئی سائیکلوں پر اشتہار کے طور پر دیا جاتا ہے۔

میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے والے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سو جاتا تھا۔ اس دوران میں ممد بھائی سے کیسے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں اور سارا دن عرب گلی میں گذار کر ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں۔ مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میری ملازمت ہی بڑی واہیات قسم کی تھی۔

ممد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوئنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا کیوں کہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تنہا تھا۔ میرے ساتھ ایک آدمی رہتا تھا اس کو پونا میں نوکری مل گئی تھی اس لئے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کھولی میں رکھا تھا وہ میرے لئے ناکافی تھا اور دوست یار کوئی پاس نہیں تھا جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں۔ دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا۔ انفلوئنزا تھا، ملیریا تھا یا اور کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو

مجھے دلاسہ دے۔ دلاسہ نہ دے تو کم از کم ایک سکنڈ کے لئے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے۔ تاکہ مجھے یہ خوشگوار احساس ہو کہ مجھے پرسنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں لیتا رہا۔ مگر کوئی نہ آیا۔ آنا بھی کسے تھا ـــــ میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے ـــــ دو تین یا چار اور وہ اتنی دور رہتے تھے کہ ان کو میری موت کا بھی علم نہیں ہو سکتا تھا ـــــ اور پھر وہاں بمبئی میں کون کسی کو پوچھتا ہے ـــــ کوئی مرے یا جیئے ـــــ ان کی بلا سے۔

میری بہت بُری حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیوی بیمار تھی اس لئے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا۔ بڑی نڈھال حالت میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خود نیچے اتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرا جسے بمبئی کی زبان میں "باہر والا" کہتے ہیں، ہوگا۔ بڑی مریل آواز میں کہا "آجاؤ"۔

دروازہ کھلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی، جس کی مونچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں۔ اندر داخل ہوا۔

اس کی مونچھیں ہی سب کچھ تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی مونچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وجود کو زندگی بخش رکھی ہے۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہوئے میری کھاٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے۔ عجیب و غریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے آدمی نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا "منٹو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟" منٹو کا دمٹو

بن جانا میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں اس موڑ میں کبھی نہیں تھا کہ میں اس کی اصلاح کرتا۔ میں نے اپنی نحیف آواز میں اس مونچھوں والے آدمی سے صرف اتنا کہا "آپ کون ہیں؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا "ممد بھائی"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "ممد بھائی ـــــ تو ـــــ تو آپ ممد بھائی ہیں ـــــ مشہور دادا ـــــ"

میں نے یہ کہہ تو دیا۔ لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈیج پن کا احساس ہوا اور رک گیا۔ ممد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی مونچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کئے اور مسکرایا "ہاں ڈمٹو بھائی ـــــ میں ممد ہوں ـــــ یہاں کا مشہور دادا ـــــ مجھے باہر والے سے معلوم ہوا کہ تم بیمار ہو ـــــ سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ ممد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے۔ جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔"

میں جواب میں کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا "ائے کیا نام ہے تیرا ـــــ جا بھاگ کے جا! اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا ـــــ سمجھ گئے نا! اس سے کہہ کہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے، ایک دم جلدی آ ـــــ ایک دم ـــــ سب کام چھوڑ دے اور جلدی آ اور دیکھ، سالے سے کہنا سب دوائیں لیتا آئے۔"

ممد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا ـــــ وہ تمام داستانیں میرے بخار آلودہ دماغ میں چل پھر رہی تھیں جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سُن چکا تھا ـــــ لیکن گڈمڈ صورت میں کیوں کہ بار بار اس کو دیکھنے کی وجہ سے اس کی مونچھیں سب پر چھا جاتی تھیں۔ بڑی خوف ناک، مگر بڑی خوبصورت مونچھیں تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملائم اور نرم و نازک ہیں، صرف خوف ناک بنانے کے لئے یہ مونچھیں رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلود

دماغ میں سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔ کھولی میں کوئی کرسی نہیں تھی۔ میں نے ممد بھائی سے کہا کہ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے سے لہجے میں کہا ـــــ "ٹھیک ہے ـــــ ہم کھڑے رہیں گے۔"

پھر اس نے ٹہلتے ہوئے ـــــ حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کرتے کا دامن اٹھا کر پائجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا ـــــ میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر چمک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے کلائی پر پھیرا۔ جو بال اس کی زد میں آئے سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن تراشنے لگا۔

اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اتر گیا تھا۔ میں نے اب کس قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا: "ممد بھائی ـــــ یہ چھری تم اس طرح اپنے نیفے میں ـــــ یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو۔ اتنی تیز ہے تمھیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟"

ممد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "دمڑو بھائی ـــــ یہ چھری دوسروں کے لئے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے۔ سالی، اپنی چیز ہے۔ مجھے نقصان کیسے پہنچائے گی۔"

چھری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے یا بیٹی ہے۔ اس کا ہاتھ مجھ پر کیسے اٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آ گیا ـــــ اس کا نام پنٹو تھا اور میں دمڑو ـــــ اس نے ممد بھائی کو اپنے کرخت انداز میں سلام کیا اور پوچھا کیا معاملہ ہے۔ جو معاملہ تھا وہ ممد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر لیکن کڑے الفاظ میں۔ جن میں حکم تھا کہ دیکھو اگر تم نے دمڑو بھائی کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمھاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پنٹو نے فرمانبردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی سٹیتھوسکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ مجھ سے بیماری کی تمام تفصیل پوچھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے نہیں، ممد بھائی سے کہا۔ "کوئی فکر کی بات نہیں ہے ملیریا ہے ـــــ میں انجکشن لگا دیتا ہوں ـــــ"

ممد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنٹو کی بات سنی اور خنجر سے اپنی کلائی کے بال اڑاتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ انجکشن دینا ہے تو دے دو، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو ـــــ"

ڈاکٹر کانپ گیا۔ "نہیں ممد بھائی ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ممد بھائی نے خنجر اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ "ٹھیک ہے۔"

"تو میں انجکشن لگاتا ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی۔

"ٹھہرو ـــــ ٹھہرو۔"

ممد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھ دی اور ہکلاتے ہوئے ممد بھائی سے مخاطب ہوا۔ "کیوں؟"

"بس میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہہ کر وہ کھولی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پنٹو نے میرے کولہے میں انجکشن لگایا، بڑے سلیقے سے ورنہ ملیریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے فیس پوچھی۔ اس نے کہا۔ "دس روپے"۔ میں تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوہ نکال رہا تھا کہ ممد بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنٹو کو دے رہا تھا۔

ممد بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "فیس دے رہا ہوں"

ممد بھائی ڈاکٹر پنٹو سے مخاطب ہوا "سالے یہ فیس کیسی لے رہے ہو؟"

ڈاکٹر پنٹو بوکھلا گیا "میں کب لے رہا ہوں۔ یہ دے رہے ہیں"

"سالا ـــ ہم سے فیس لیتے ہو ـــ واپس کرو یہ نوٹ، ممد بھائی کے لہجے میں اس کے خنجر ایسی تیزی تھی۔

ڈاکٹر پنٹو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممد بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

ممد بھائی نے اپنی ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تاؤ دیا اور مسکرا دیا۔

"دمٹو بھائی! ـــ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے۔ تمھاری قسم اپنی مونچھیں منڈوا دیتا۔ اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی۔ یہاں سب تمھارے غلام ہیں"

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا "ممد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

ممد بھائی کی مونچھیں تھرتھرائیں "ممد بھائی کسے نہیں جانتا ـــ ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے ـــ اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی۔ آئی۔ ڈی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی رہتی ہے ـــ کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت میں ہے، کون بری حالت میں ـــ تمھارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں"

میں نے از راہِ تفنن پوچھا "کیا جانتے ہیں آپ؟"

"سالا ـــ ہم کیا نہیں جانتے ـــ تم امرتسر کا رہنے والا ہے۔ کشمیری ہے ـــ یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے ـــ تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اسی لئے تم ادھر سے نہیں گذرتے۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمھاری جان

کو رد تا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔"
میں پانی پانی ہو گیا۔

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر باریک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا۔ "منٹو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمھارے سب قرض چکا دیئے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار اگر منٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا ——— اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمھیں تنگ نہیں کرے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے کیا کہوں۔ بیمار تھا۔ کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا، جس کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر کوئی مجھے نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت محنت کرنی پڑتی ——— میں صرف اتنا کہہ سکا۔ "ممد بھائی! خدا تمھیں زندہ رکھے ——— تم خوش رہو۔"

ممد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کئے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنٹو ہر روز صبح شام آتا رہا۔ میں نے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "نہیں مسٹر منٹو! ممد بھائی کا معاملہ ہے۔ میں ایک ڈیڑھیا بھی نہیں لے سکتا۔"

میں نے سوچا، یہ ممد بھائی کوئی بہت بڑا آدمی ہے، یعنی خوفناک قسم کا! جس سے ڈاکٹر پنٹو جو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے، ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرأت نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کر رہا ہے۔

بیماری کے دوران میں ممد بھائی بھی بلا ناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا تھا کبھی شام کو۔ اپنے چھ سات شاگردوں کے ساتھ اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا کہ معمولی ملیریا ہے۔ تم ڈاکٹر پنٹو کے علاج سے انشاء اللہ بہت جلد ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔

پندرہ روز کے بعد میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوران میں ممد بھائی کے ہر خدوخال

کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر بھی پچیس تیس کے درمیان ہوگی۔ پتلی پتلی باہنیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھرتیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا سا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا تو وہ سیدھا اس کے دل میں کھبتا تھا۔ یہ مجھے عرب گلی کے لوگوں نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ اس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چھری مار وہ اول درجے کا تھا۔ بنوٹ اور گتکے کا ماہر۔ یوں سب کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے۔ مگر میں یہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن میں جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے رہتا ہے؟

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اپنا وہی خوفناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "ممد بھائی ـــــ آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے۔ تم یہ خنجر کیوں لئے پھرتے ہو؟"

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا "دمٹو بھائی بندوق پستول میں کوئی مزا نہیں۔ انھیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔ گھوڑا دبا دیا اور ٹھاہ اس میں کیا مزا ہے؟ ـــــ یہ چیز ـــــ یہ خنجر ـــــ یہ چھری ـــــ یہ چاقو ـــــ مزا آتا ہے نا، خدا کی قسم ـــــ یہ وہ ہے ـــــ تم کیا کہا کرتے ہو ـــــ ہاں ـــــ آرٹ ـــــ اس میں آرٹ آتا ہے میری جان ـــــ جس کو چاقو چھری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے۔ پستول کیا ہے ـــــ کھلونا ہے ـــــ جو نقصان پہنچا

سکتا ہے ـــــ پر اس میں کیا لطف آتا ہے ـــــ کچھ بھی نہیں ـــــ تم یہ خنجر دیکھو ـــــ اس کی تیز دھار کو دیکھو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پر پھیرا۔" اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا ـــــ بس یوں پیٹ کے اندر داخل کر دو۔ اس صفائی سے کہ اس سالے کو معلوم تک نہ ہو ـــــ بندوق پستول سب بکواس ہے۔"

ممد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنون احسان تھا لیکن جب میں اس کا ذکر کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم تھا۔ ایک حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کو کوئی تکلیف ہو، ممد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا اور یہ اس کی سی آئی ڈی کا کام تھا جو اس کو ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دادا تھا یعنی ایک خطرناک غنڈہ۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے کہ میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی تھیں لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی اس طرح پرورش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی مونچھوں کا ایک اک بال کھڑا تھا، جیسے خارپشت کا ـــــ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ممد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھاتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک

تھیں ۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی ممدبھائی تھا ـــــ یا اس کا خنجر جو اس کی تنگ گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا، نہ معلوم کیوں ؟

ممدبھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا، لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے، پر وہ ہر حاجت مند کی بروقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھیں ۔ چوں کہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا اس لئے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کی کسی طوائف سے ہوتا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

میری اس کی بڑی دوستی ہو گئی تھی ۔ ان پڑھ تھا، لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کھاتے تھے ۔ ایک دن صبح سویرے دفتر جاتے وقت میں نے چینی کے ہوٹل میں کسی سے سنا کہ ممدبھائی گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ مجھے بہت تعجب ہوا اس لئے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے، کیا وجہ ہو سکتی تھی ؟

میں نے اس آدمی سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو ممدبھائی گرفتار ہو گیا ۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس عرب گلی میں ایک عورت رہتی ہے جس کا نام شیریں بائی ہے ۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے ۔ اس کو کل ایک آدمی نے خراب کر دیا۔ یعنی اس کی عصمت دری کر دی شیریں بائی روتی ہوئی ممدبھائی کے پاس آئی اور اس نے کہا ـــــ "تم یہاں کے دادا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے یہ برا کام کیا ہے ـــــ لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو"ـــــ ممدبھائی نے ایک موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا "تم کیا چاہتی ہو؟"ـــــ

اس نے کہا "میں یہ چاہتی ہوں کہ تم اس حرامزادے کا پیٹ چاک کر دو"

ممدبھائی اس وقت ہوٹل میں سیں پاؤں کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سن کر اس نے اپنے نیفے میں سے خنجر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی اور بڑھیا سے کہا۔

"جا ـــــ تیرا کام ہو جائے گا۔"

اور اس کا کام ہو گیا ـــــ دوسرے معنوں میں جس آدمی نے اس بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔

ممد بھائی گرفتار تو ہو گیا تھا۔ مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چابکدستی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ کبھی عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

دو دن حوالات میں رہا تھا، مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی انسپکٹر سب اس کو جانتے تھے۔ لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اٹھی ہوئی تھیں، اب کسی قدر جھکی ہوئی تھیں۔

چینی کے ہوٹل میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے کپڑے جو ہمیشہ اجلے ہوتے تھے، میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی، لیکن اس نے خود کہا "منٹو صاحب! مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ سالا دیر سے مرا ـــــ چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑا۔ لیکن وہ بھی اس سالے کا قصور تھا ـــــ ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا ـــــ لیکن مر گیا ـــــ ذرا تکلیف کے ساتھ، جس کا مجھے افسوس ہے۔"

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ سن کر میرا ردعمل کیا ہو گا۔ یعنی اس کا افسوس تھا کہ وہ اسے بہ طریق احسن قتل نہ کر سکا۔ اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔

مقدمہ چلتا تھا ـــــ اور ممد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے پہلے بھی قتل کئے تھے کہ نہیں، لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ مجسٹریٹ، وکیل اور گواہ کے متعلق

کچھ نہیں جانتا تھا اس لئے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔

وہ بہت فکر مند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہوگئی تو ممد بھائی بہت پریشان ہوگیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کیسے حاضر ہوا جاتا ہے، اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرخت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا "منٹو صاحب! میں مرجاؤں گا، پر کورٹ میں نہیں جاؤں گا ـــــ سالی معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔"

عربپ گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انھوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں، ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف یقینی طور پر کوئی مخالف جذبہ پیدا کرسکتی ہیں۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، اس کی صرف مونچھیں ہی تھیں جو اس کو خوفناک بناتی تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہرگز ہرگز "دادا" دکھائی نہ دیتا۔

اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہوگئی تھی۔ اب اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی کے ہوٹل میں جب میری اس کی ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہوا تو بہت ممکن ہے اس کو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے۔ اس لئے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کو مونچھوں کی فکر تھی کیوں کہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا "ممد بھائی ـــــ تم کو کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کے ساتھ کبھی نہ جانا۔ مجسٹریٹ تم کو اندر کردے گا۔"

اور وہ سوچتا تھا ـــــ ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے ـــــ لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خنجر معلوم نہیں، جو پہلی مرتبہ خون آشنا ہوا تھا، یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا اپنے نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا "ممد بھائی یہ کیا؟"

"کچھ نہیں، وٹو بھائی۔ بہت گھوٹالا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے۔ یار دوست کہتے ہیں کہ تمھاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تم کو سزا دے گا۔ اب بولو میں کیا کروں؟"

میں کیا بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی مونچھوں کی طرف دیکھا جو واقعی بڑی خوفناک تھیں۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا ـــــ "ممد بھائی! بات تو ٹھیک ہے ـــــ تمھاری مونچھیں مجسٹریٹ کے فیصلے پر اثر انداز ہوں گی ـــــ سچ پوچھو تو جو کچھ ہو گا، تمھارے خلاف نہیں ـــــ مونچھوں کے خلاف ہو گا۔"

"تو میں منڈوا دوں؟" ممد بھائی نے اپنی چہیتی مونچھوں پر بڑے پیار سے انگلی پھیری ـــــ

میں نے اس سے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال جو کچھ بھی ہے وہ تم نہ پوچھو ـــــ لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انھیں منڈوا دوں، تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں۔ وٹو بھائی ـــــ"

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا "ہاں اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو ـــــ عدالت کا سوال ہے اور تمھاری مونچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔"

دوسرے دن ممد بھائی نے اپنی مونچھیں ـــــ اپنی جان سے عزیز مونچھیں منڈوا ڈالیں۔ کیوں کہ اس کی عزت خطرے میں تھی۔ لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر۔

مسٹر الیف۔ ایچ۔ ٹیل کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا، اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی لیکن مجسٹریٹ نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں ـــــ مگر وہاں کوئی بال ہی نہ تھا۔

شام کو اسے جب بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا، میری اس کی ملاقات ایرانی کے ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی ـــــ مونچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا "کیا بات ہے ممد بھائی؟"

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خدا معلوم کس کو دی اور کہا ـــــ "سالا اب ممد بھائی ہی نہیں رہا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ صوبہ بدر کیا جا چکا ہے۔ "کوئی بات نہیں ممد بھائی یہاں نہیں تو کسی اور جگہ سہی۔"

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں ـــــ "سالا ـــــ اپن کو یہ غم نہیں ـــــ یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں ـــــ یہ سالا مونچھیں کیوں منڈوائیں؟"

پھر اس نے ان لوگوں کو جنھوں نے اس کی مونچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا ایک کروڑ گالیاں دیں اور کہا۔ "سالا اگر مجھے تڑی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہوا۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ "سالا تم کیسا آدمی ہے، دمڑو صاحب،

—— ہم سچ کہتا ہے۔ خدا کی قسم ہمیں پھانسی لگا دیتے —— پر —— یہ بیوقوفی تو ہم نے خود کی —— آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا —— سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا۔"

یہ کہہ کر اس نے دو ہتڑ اپنے منہ پر مارا۔ "ممد بھائی لعنت ہے تجھ پر —— سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا —— اب جا اپنی ماں کے ....."

اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔

# بو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہار رہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگ دار پلنگ پر جو اب کھڑکی کے پاس سے تھوڑا ادھر سرکا دیا گیا تھا ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے پاس باہر پیپل کے نہائے ہوئے پتے رات کے دودھیا اندھیرے میں جھومروں کی طرح تھرتھرا رہے تھے ـــــ اور شام کے وقت جب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی ساری خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد کچھ سنانے کے لئے وہ بالکنی میں آکھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لئے املی کے پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھانس کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اس کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دن سے شدید قسم کی تنہائی سے اکتا گیا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی تقریباً تمام کرسچین چھوکریاں جو سستے داموں مل جایا کرتی تھیں عورتوں کی انگریزی فوج میں بھرتی ہو گئی تھیں، ان میں سے کئی ایک نے فورٹ کے علاقے میں ڈانس اسکول کھول لئے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی ـــــ رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔

اس کی انا کا سبب تو یہ تھا کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں اور دوسرا یہ کہ رندھیر فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ اور خوبصورت نوجوان تھا۔ لیکن اس پر فورٹ کے لگ بھگ تمام کلبوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ کیوں کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج محل ہوٹل کی کئی مشہور و معروف کرسچین چھوکریوں سے جسمانی تعلقات قائم کر چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس قسم کے تعلقات کی بنا پر وہ کرسچین لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا جن سے یہ چھوکریاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی بیوقوف سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے بس یوں ہی ہیجل سے بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیجل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح وردی پہن کر اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویئے سے جما کر باہر نکلتی تھی اور ایسے بانکپن سے چلتی تھی جیسے فٹ پاتھ پر چلنے والے سبھی لوگ ٹاٹ کی طرح اس کے قدموں میں بچھے چلے جائیں گے۔

رندھیر سوچتا تھا کہ آخر کیوں وہ ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا زیادہ مائل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام دکھائی جا سکنے والی اشیاء کی نمائش کرتی ہیں کسی قسم کی جھجک محسوس کئے بغیر اپنے کارناموں کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے بیتے ہوئے پرانے رومانسوں کا حال سنا دیتی ہیں ——— یہ سب ٹھیک ہے لیکن کسی دوسری عورت میں بھی تو یہ خاصیتیں ہو سکتی ہیں۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے کسی طرح بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سلا لے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچاری کو

منو نیا ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا " یہ کپڑے اتار دو ۔ سردی لگ جائے گی ۔"
وہ رندھیر کی اس بات کا مطلب سمجھ گئی تھی کیوں کہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے لیکن بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا لہنگا اتار دیا جس پر میل بھیگنے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہو گیا تھا ـــــ لہنگا اتار کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی ۔ پھر اس نے اپنی تنگ بھنچی بھنچی چولی اتارنے کی کوشش کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی ۔ وہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے لیکن سمٹیلے گڑھے میں چھپ گئی تھی ۔
دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بھیگنے کی وجہ سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی ۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گئی تو اس نے مراٹھی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا ـــــ " میں کیا کروں ـــــ نہیں نکلتی ۔"
رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گانٹھ کھولنے لگا ۔ جب نہیں کھلی تو اس نے چولی کے دونوں سروں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ گانٹھ سراسر پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں ایک دم سے نمایاں ہو گئیں ۔ لمحہ بھر کے لئے رندھیر نے سوچا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر، نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو ماہر کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل بنا دی ہے ۔
اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدگداہٹ ، وہی دھڑکن ، وہی گولائی، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ برتنوں میں ہوتی ہے ۔
مٹمیلے رنگ کی جوان چھاتیوں میں جو بالکل کنواری تھیں ، ایک عجیب و غریب قسم کی چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہوتے ہوئے بھی چمک نہیں تھی ۔ اس کے سینے پر یہ

ابھار دو دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی پر جل رہے تھے۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی میں شرابور ہو چکے تھے ایک گدلے ڈھیر کی صورت میں فرش پر پڑے تھے اور وہ زندھیر کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے بدن کی گرمی زندھیر کے جسم میں ایسی ہلچل سی پیدا کر رہی تھی جو سخت جاڑے کے دنوں میں نائیوں کے غلیظ لیکن گرم حماموں میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔

دن بھر وہ زندھیر کے ساتھ چپٹی رہی ——— دونوں جیسے ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ انھوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ بھی کہنا سننا تھا سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہو رہا تھا۔ زندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے گول دانے جو چاروں طرف ایک سیاہ دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، ان ہوائی جھونکوں سے جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے پورے بدن میں ایک ایسی سرسراہٹ پیدا ہو جاتی کہ خود زندھیر بھی کپکپا اٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے زندھیر کا سینکڑوں بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ ان کے مزے بھی بخوبی جانتا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم و نازک اور سخت سینوں سے اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی کئی راتیں گذار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ ساری باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کے کانوں کے لئے نہیں ہوتیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی تعلق قائم کر چکا تھا جو ساری محنت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں ——— لیکن یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے پیڑ کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جسے اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا بالکل مختلف قسم کی لڑکی تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو بھی تھی اور بدبو بھی ـــــ وہ ساری رات پیتا رہا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، جسم کے ہر حصے سے یہ جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی رندھیر کے پورے سراپا میں بس گئی تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز اتنی قریب نہ ہوتی اگر اس کے جسم سے یہ بو نہ اٹھتی ـــــ یہ بو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام نئے پرانے محسوسات میں رچ گئی تھی۔

اس بو نے اس لڑکی اور رندھیر کو جیسے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ ان بیکراں گہرائیوں میں اتر گئے تھے جہاں پہنچ کر انسان ایک خالص انسانی تسکین سے محظوظ ہوتا ہے۔ ایسی تسکین جو لمحاتی ہونے پر بھی جاوداں تھی مسلسل تغیر پذیر ہونے پر بھی مضبوط اور مستحکم تھی۔ دونوں ایک ایسا جزیرہ بن گئے تھے جو آسمان کے نیلے خلا میں مائل پرواز رہنے پر بھی دکھائی دیتا ہے۔

اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی رندھیر بخوبی سمجھتا تھا لیکن سمجھتے ہوئے بھی وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح کبھی مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی بو نکلتی ہے ـــــ لیکن نہیں، وہ بو کچھ اور ہی طرح کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کی آمیزش نہیں تھی، وہ بالکل اصلی تھی ـــــ عورت اور مرد کے جسمانی تعلقات کی طرح اصلی اور مقدس۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی۔ نہانے کے بعد وہ ہمیشہ بغلوں وغیرہ میں پاؤڈر چھڑکتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے وہ بدبو جاتی رہے لیکن تعجب ہے کہ اس نے کبھی بھی ـــــ ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہیں آئی بلکہ عجیب قسم کی تسکین کا احساس ہوا۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ

اس بوکو جانتا ہے پہچانتا ہے، اس کے معنی بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو نہیں سمجھا سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے ـــــ یوں ہی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تو پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا لیکن اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی سمائی ہوئی تھی جیسے بارش کی بوندوں کے ہمراہ ستاروں کا ہلکا ہلکا غبار نیچے اتر آیا ہو ـــــ برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اس کمرے میں ساگوان کا صرف ایک ہی پلنگ تھا۔ لیکن اب اس کے ساتھ سٹا ہوا ایک اور پلنگ بھی تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے۔ موسم بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ بارش کی بوندوں کے ہمراہ ستاروں کی روشنی کا ہلکا ہلکا غبار سا اسی طرح اتر رہا تھا لیکن فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے جھومتے ہوئے پتوں پر بارش کی بوندوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ ایک گوری چٹی لڑکی اپنے عریاں جسم کو چادر میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے قریب قریب سو گئی تھی۔ اس کی سرخ ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی جس کے گہرے سرخ رنگ کے ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ پلنگ پر اس کے دوسرے آدھے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ سنہری پھول دار جمپر، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ ـــــ سب کا رنگ سرخ تھا۔ گہرا سرخ اور ان سب میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مکیش کے ذرّے دھول کے ذرّوں کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر پاؤڈر، سرخی اور مکیش کے ان ذروں نے مل جل کر ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا تھا ـــــ بے نام سا اڑا اڑا رنگ اور اس کے گورے سینے پر کچے رنگ کی انگیا نے جگہ جگہ سرخ دھبے بنا دیئے تھے۔

چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں ـــــ ان میں ہلکا ہلکا نیلاپن بھی تھا۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہوگیا تھا۔

رندھیر اس لڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر کئی بار سوچ چکا تھا ـــــ کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اس کو لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہو۔ کتابوں اور چینی کے برتنوں پر ہلکی ہلکی خراشیں پڑ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے جسم پر بھی کئی نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو اس کی پیٹھ پر اور سامنے سینے پر نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے چاروں طرف کس کر باندھے ہوئے ازار بند کا نشان ـــــ وزنی اور نکیلے جڑاؤ نیکلس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ جیسے ناخنوں سے بڑے زور سے کھجایا گیا ہو۔ برسات کے وہی دن تھے۔ پیپل کے نرم نرم پتوں پر بارش کی بوندیں گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی رندھیر اس دن ساری رات سنتا رہا تھا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں خاکے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ کی طرح سفید سینے پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے تھے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے بدن میں کئی چنگاریاں دوڑتی ہوئی محسوس کی تھیں۔ اس نازک بدن میں کئی جگہوں پر سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی اسے پتہ چلا تھا جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر رونگٹے نے اس لڑکی کے بدن کے چھڑے ہوئے تاروں کی بھی آواز سنی تھی ـــــ مگر وہ آواز کہاں تھی؟ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے بدن

کی بو میں سونگھی تھی ـــــ وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے زیادہ مسرور کن ہوتی ہے، وہ پکار جو حلقۂ خواب سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بالکل قریب ہی پیپل کے نہائے ہوئے پتے جھوم رہے تھے۔ وہ ان کی مستی بھری کپکپاہٹوں کے اس پار کہیں بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں مٹمیلے بادلوں میں عجیب و غریب قسم کی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی ـــــ ٹھیک ویسے ہی جیسی اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آتی تھی۔ ایسی روشنی جو پراسرار گفتگو کی طرح دبی لیکن واضح تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی ـــــ جس کا جسم دودھ اور گھی میں گندھے ہوئے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی ـــــ اس کے نیند سے ماتے بدن سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی ـــــ جو اب تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور جنوں کی حد تک پہنچی ہوئی خوشبو بہت بری معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس تھی ـــــ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جیسی بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس ـــــ بے رنگ ـــــ بے چین۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا جس طرح پھوٹے ہوئے دودھ کے بے رنگ پانی میں سفید مردہ پھٹکیاں تیرنے لگتی ہیں اسی طرح اس لڑکی کے دودھیا جسم پر خراشیں اور دھبے تیر رہے تھے اور وہ حنا کے عطر کی اوٹ پٹانگ خوشبو ـــ دراصل رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بنا کسی بیرونی کوشش کے از خود نکل رہی تھی۔ وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور رس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جس میں سونگھے جانے کی کوشش شامل نہیں تھی۔ وہ خود بخود ناک کے راستے اندر گھس کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ جاتی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کے طور پر اس لڑکی کے دودھیا جسم پر ہاتھ پھیرا لیکن اسے کوئی کپکپی محسوس نہ ہوئی ـــــ اس کی نئی نویلی بیوی جو ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی

بیوی تھی، جس نے بی۔ اے۔ تک تعلیم حاصل کی تھی اور جو اپنے کالج کے سینکڑوں لڑکوں کے دلوں کی دھڑکن تھی، رندھیر کی کسی بھی حس کو نہ چھو سکی۔ وہ حنا کی خوشبو میں اس بو کو تلاش کر رہا تھا جو انھیں دنوں میں جب کہ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے، اس گھاٹن لڑکی کے میلے بدن سے آتی تھی۔

# موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حد نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے، جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے بھوت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ ایک بالکل نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ـــــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان

جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ..... محلے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ــــ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ــــ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا۔ آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ــــ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنویں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا۔ وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ نرنجن یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گذر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارا کر لیا کرتا ہے ــــ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ــــ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبے ہے ــــ بمبے۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ــــ بارہ برس سے۔

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں

تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے، جیسے اس کے پاس چھومنتر ہے ـــــ یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔ مگر ترلوچن صبح ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ ـــــ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لئے اچھا تھا ـــــ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگھر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی ـــــ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک اور لچکیلی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گھٹاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی گاؤں کا تھا مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج

کی تعلیم شروع ہوگئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ــــ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا۔ شاید اس لیئے وہ ہر بار اسس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب وغریب واقعات سے پر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ ــــ پھر بمبئی۔ جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بری نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزارہا دیے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے عشق ہوگیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ، موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے ـــ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے

لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ـــــ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی ـــــ بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور ـــــ جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل ـــــ ساری موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی "یہ کھڑاؤں اکدم کنڈم چیز ہے" اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت اٹھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں "گوڈے، گوڈے" دھنس

جائے گا۔ وہ اس سے کچھ اس قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر وہ فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موزیل کے لئے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں مگر اس کا کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ لیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیوں کہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو —— یہ نازک باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا "کون سی نازک باتیں —— تمھارے پرانے یاروں کی؟"

موزیل اپنے دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولھوں پر لٹکا کر اپنی تنگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔ ہاں وہ میرے یار ہیں اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا "اس طرح تمھاری میری کس طرح نبھے گی؟"

موزیل زور سے قہقہہ لگاتی "تم سچ مچ سکھ ہو —— ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ —— اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی

کرلو۔ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔"

ترلوچن نرم ہوجاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردعمل انتقام ہوتا ہے۔ مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں۔ اور کئی کالوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ـــــ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیر دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ـــــ "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ـــــ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔"

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔
"تم شیو کرالو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ـــــ تو میں شرط لگاتی ہوں۔ کئی لونڈے تمھیں آنکھ ماریں گے ـــــ تم خوبصورت ہو۔"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیٰحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ـــــ تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا: "موذیل!"

موذیل دینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں۔ "خدا کی قسم ـــــ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ـــــ ان کے بال ایسے ہیں کہ میرا نیوی بلو اسکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ـــــ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی۔"

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی اس میں جوئیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرمانبردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا
"یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی "تمھارے بال بہت ملایم ہیں ـــــ میرا
اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو اسکرٹ صاف ہو سکے گا ـــــ ترلوچ ـــــ
یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فرسٹ کلاس بٹوا بنواؤں گی۔"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے
مخاطب ہوا "میں نے آج تک تمھارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا ـــــ تم کیوں اڑا
ہو ـــــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ـــــ میں یہ کبھی برداشت
نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ـــــ کیا تمھیں اس
پتہ نہیں۔"

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا "مجھے معلوم ہے۔"

"پھر" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہہ کئے اور موذیل کے
دانتوں سے پنیں نکال لیں "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں۔ میں تم سے
شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے
ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی "میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کر
گی۔"

ترلوچن اچھل پڑا "سچ؟"

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبو
دانت ایک لحظے کے لئے چمکے "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ

تو.... تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی "جب ـــــ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے۔"

ترلوچن اس وقت 'جو ہو سو ہو' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا "میں کل ہی
ا دوں گا۔"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ـــــ تم میں اتنی
ت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچ کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا
تم دیکھ لو گی۔"

"دیکھ لوں گی" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "بھوں
بھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا۔ وہ کن کن اذیتوں سے گذرا، اس کا تذکرہ فضول ہے۔
لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔

یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس
آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین
کی بھی کچھ دیر کے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا جو سیلون سے باہر نکلنے پر اس
لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا جہاں ٹنکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔
چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے
زچیٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ موذیل آئی۔
لوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹھکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ"

کہہ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ـــــ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی اسکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ـــــ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے اسکرٹ نیچی کی۔ اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن لیا کرو"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ـــــ ایسے ہی چلتا ہے"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آگیا جب وہ اور موذیل، دونوں ٹکرا گئے تھے۔ اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "شادی کل ہو گی"

"ضرور" موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونا بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچ کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونا روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا ـــــ ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے

ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے دیولا چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری ؟ ـــــ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ـــــ اتنے میں اس کی ملاقات کریال کور سے ہوگئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے پاس بیتھر لگے ہوئے تھے۔ اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی۔ اور پھر جھوڑ کر کر کڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ـــــ وہ بے حیا تھی ـــــ بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے وہ کبھی کبھی اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی کار خریدی تھی۔ یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔ لیکن اپنی مرضی سے ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے۔ مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس تماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی

ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو ـــــ مجھے تم سے نفرت ہے۔"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گذارتی۔ دو ٹک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویر اس کو ناپسند تھے اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم وحیا کا واسطہ دیا مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ـــــ اگر تمھیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا یا جس میں سے تمھاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ـــــ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔ تم سکھ ہو ـــــ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے ـــــ یہ بھی تمھاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمھارے مذہب میں شامل ہے ـــــ شرم آنی چاہئے تمھیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمھارا مذہب تمھارے انڈرویر میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا کرتا تھا مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بے کار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کرپال کور ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایک ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں ـــــ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پرواہ کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھ رہی تھی مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک بار برتھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ـــــ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں۔ ـــــ آواز قریب آتی گئی۔ یک لخت اس نے دوسری ٹینکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا کہ آس پاس کی ہوا پھٹ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ـــــ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ـــــ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ـــــ ترلوچن کی آنکھوں

کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیلی ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردعمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی۔ اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی۔ "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ "اب برش اس قابل ہے کہ میری نیوی بلو اسکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔ "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ـــــ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایک صرف یہ کہ وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔ "بیمار رہی ہو؟"

"نہیں۔" موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو۔"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔ "تم گویا کہ ـــــ اب پھر ـــــ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا "ہاں۔"

"مبارک ہو۔" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔ "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی۔"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں۔"

"مبارک ہو ـــــ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں۔"

"یہ بہت بری بات ہے۔" موزیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ "ہمیشہ آدمیوں کو اپنے ہم سایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔ موزیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔ "کیا اسی نے تمھیں بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں۔"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موزیل کے ہونٹوں پر لب اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے مری رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ـــــ موزیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وفا ہے۔ بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موزیل سے صرف اتنا کہا۔ "موزیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں میرے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی ہے جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

موزیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی۔ لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمھیں کیسے قبول کرے گی؟ کیا

اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟"

اس کو ابھی معلوم نہیں ـــــ داڑھی میں نے تمھارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی محض انتقامی طور پر ـــــ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی شکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں ـــــ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی کوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔ "یہ بہت اچھا ہے ـــــ مگر یہ کمبخت مچھر یہاں موجود ہے۔ دیکھو کس زور سے کاٹا ہے۔"

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "کب ہو رہی ہے تمھاری شادی؟"

"ابھی کچھ پتہ نہیں۔" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموش رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔ "ترلوچ! تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ "تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو ـــــ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! ـــــ موذیل! تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ـــــ کسی بھی معاملے کی نزاکت ـــــ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو ـــــ یہی وجہ ہے کہ تمھارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ "افسوس بی ڈیمڈ ـــ

سلی ایڈیٹ ـــــ تم یہ سوچو کہ تمھاری اس ـــــ کیا نام ہے اس کا ـــــ اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ـــــ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ـــــ تمھارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے ـــــ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو اور بہت ڈرپوک ۔ مجھے نڈر مرد چاہیے ـــــ لیکن چھوڑو ان باتوں کو ـــــ چلو آؤ تمھاری اس کو رکوالے آئیں۔"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ـــــ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے ؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے ۔ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ـــــ چلے آؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سنو تو ـــــ کرفیو ہے۔"

"موذیل کے لئے نہیں ـــــ چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی رک گئی ۔ ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے کہا "کیا بات ہے ؟"

موذیل نے کہا "یہ تمھاری داڑھی ـــــ لیکن خیر ٹھیک ہے ۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔"

"ننگے سر" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں ؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی "تم سمجھتی نہیں ہو ۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ـــــ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا کرنا نہیں چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ "تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو ـــــ گدھے کہیں کے ـــــ اس کی جان کا سوال ہے ـــــ کیا نام ہے تمھاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو؟"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے ـــــ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

موذیل چڑ گئی۔ "اوہ، تمھاری محبت بی ڈیمڈ۔ میں پوچھتی ہوں کیا سارے سکھ تمھاری طرح بیوقوف ہوتے ہیں ـــــ اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔ اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو ـــــ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس علاقے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ـــــ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں ـــــ اگر میں تمھارے ساتھ وہاں جاؤں تو پگڑی پہن کر جاؤں گا ـــــ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے تمھاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ـــــ تمھاری وہ ـــــ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ـــــ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا ـــــ تم سکھ ہو ـــــ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو؟"

ترلوچن بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ "ڈارلنگ چلو جیسے تمہاری مرضی ـــــ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی؟"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "نہیں ـــــ چلے گا اسی طرح۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی ننگی ٹانگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا ـــــ "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مسکرائی۔ "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس سے پہلے کئی اور مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی واقعی تم نے بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا ـــــ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی

تھی ۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی ۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی ۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی ۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے ۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی "اے ـــــ کدھر جا رہا ہے"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا "اوہ تم ـــــ تم ہم کو پہچانا نہیں تم نے ـــــ موذیل" ـــــ پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا ـــــ "ادھر اس باجو ـــــ ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے ۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے"

سپاہی اس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا "لو پیو"

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگریٹ نکالا اور اس سے کہا ـــــ "ہیر از لائٹ"

سپاہی نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی جس میں گذر کر انھیں محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے ـــــ خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی ۔ سمندر کی پیل تن لہریں

سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کا ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مارنمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا: "ترلوچ ڈیر ـــــ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ـــــ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا ـــــ سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے، جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی ـــــ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دوکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا: "کوئی بات نہیں۔ چلے آؤ۔"

دونوں چلنے لگے ـــــ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا ـــــ کہ موذیل آگئی لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے۔ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا ـــــ "اے کیا کرتا ہے ـــــ اپنے بھائی کو مارتا ہے ـــــ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔"

پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی "کریم! اٹھاؤ یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔"

اس آدمی نے نیفے سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ٹھوکا دیا "عیش کر سالی ـــــ عیش کر۔"

پھر اس نے برات اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے۔"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا "کوئی ذلیل حرکت نہیں سب چلتا ہے.... آؤ۔"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ـــــ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گئے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں ـــــ نکڑ والی بلڈنگ۔"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے کے رونے تک کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ـــــ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جاؤ۔ پھر اس نے ہولے سے کہا "ترلوچ ڈیر ـــــ یہ پگڑی اتار دو۔"

ترلوچن نے جواب دیا "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا۔"

موذیل جھنجھلا گئی "تمھاری مرضی ـــــ لیکن تم دیکھتے نہیں سامنے کیا ہو رہا ہے۔"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ـــــ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو ایسا کرو ـــــ میں بھاگ کر نکڑ والی

بلڈنگ میں جاتی ہوں۔ تم میرے پیچھے آنا۔ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو سمجھے ـــــ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑائیں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔ سیڑھیوں کے پاس ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا مالا ہے؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا۔"

"چلو۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔ ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "ہنگا سنگھ جی ـــــ ہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی "کون؟"

"ترلوچن۔"

دروازہ دھیرے سے کھلا ـــــ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ـــــ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لئے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت پیاری تھی، مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اسے اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "ڈرو نہیں، ترلوچن تمھیں آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہوگئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ـــــ ماتا جی سے بھی ـــــ لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی ہوئی چیخ بلند ہوئی "اسے پکڑ لیا انھوں نے۔"

ترلوچن نے پوچھا "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ـــــ تم یہ کپڑے اتارو۔"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہیں پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار ڈھیلا کیا اور شلوار اتار کر ترلوچن سے کہنے لگی "جاؤ اسے لے جاؤ ـــــ لیکن ٹھہرو!"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا "جاؤ ــ جلد نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا "آؤ" مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کو دیکھا جو دھوئے ہوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال تھے

باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ ـــــ تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑ دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس انھوں نے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔ "تو صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں۔"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ "دروازہ۔"

موذیل ترلوچن سے مخاطب رہی۔ "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں ـــــ تو میرے پیچھے بھاگنا ـــــ میں اوپر چڑھ جاؤں گی ـــــ تم بھی اوپر چلے آنا ـــــ یہ لوگ دروازہ توڑ رہے ہیں سب بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔"

ترلوچن نے پھر پوچھا ـــــ "پھر!"

موذیل نے کہا "یہ تمھاری ـــــ کیا نام ہے اس کا ـــــ موقعہ پاکر نکل جائے ـــــ لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ "دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری ـــــ سب لوگ بوکھلا گئے۔ اٹھ کر اس

نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔
موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی ـــــ کھڑکیوں اس کے پیروں میں تھی
ـــــ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں
دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ـــــ اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر تیسرے
زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آرہی ـــــ پتھریلے فرش پر
ترلوچن اکدم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا
منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے
تھے ارد گرد جمع ہو گئے ـــــ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل
کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔
ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی "موذیل ـــــ موذیل"
موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال سرخی ہو رہی تھیں اور مسکرائی
ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی
اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا "جاؤ، دیکھو ـــ
میرا انڈر ویر وہاں ہے کہ نہیں ـــــ میرا مطلب ہے وہ ....."
ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے سے
کہا "تم سچ مچ سکھ ہو ـــــ جاؤ دیکھ آؤ"
ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں
سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا "یہ میاں بھائی ہے ـــــ لیکن بہت دا
قسم کا ـــــ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔
ترلوچن واپس آگیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی
ہے ـــــ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا ـــــ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ

سے بہہ نکلا ـــــ اوڈیم اٹ ـــــ" یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منھ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی "آل رائٹ ڈارلنگ ـــــ بائی بائی"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی "لے جاؤ اس کو ـــــ اپنے اس مذہب کو" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

# ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جوں ہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لئے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گذر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر انہیں ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار۔ ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے مگر اس کے قد و قامت اور خد و خال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لئے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گذر گئے تو کلونت کور جھلک پڑی لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی "ایشر سیاں"۔

ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی "ایشر سیاں"۔ لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کر اس جانب جاتے ہوئے بولی "کہاں غائب رہے تم اتنے دن"۔

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "مجھے معلوم نہیں"۔

کلونت کور بھنا گئی "یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے"۔

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جواب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا اور اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا "جانی کیا ہوا تمھیں"۔

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا "کلونت!"

آواز میں درد تھا۔ کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔

"ہاں جانی!" کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا۔ "یہ کڑی یا، دماغ ہی خراب ہے"۔

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا "ایشر سیاں کہاں رہے تم اتنے دن؟"

"برے کی ماں کے گھر۔" ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔ "قسم واہگورو کی، بڑی جاندار عورت ہو۔"

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیئے اور پوچھا۔

"تمہیں میری قسم بتاؤ کہاں رہے؟ ——— شہر گئے تھے؟"

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں۔"

کلونت کور چڑ گئی۔ "نہیں تم ضرور شہر گئے تھے ——— اور تم نے بہت سارا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔"

کلونت کور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا؟ ——— اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے۔ پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے۔"

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا "دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا ——— ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔"

"تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔"

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "ایشر سیاں، کیا بات ہے تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟"

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔

"جانی میں وہی ہوں ——— گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی۔"

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی "تمھیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟"

"بُرے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔"

"بتاؤ گے نہیں؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ نہ بولو۔"

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیئے۔ اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیئے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آگئی۔ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا "آؤ جانی! ایک بازی تاش کی ہو جائے۔"

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا "چل دفان ہو۔"

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولھے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی "نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔"

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتا اتار کر پھینک دیا اور کہا۔ "پھر ہو جائے تُرپ چال۔"

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا۔ ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیص کا گھیرا پکڑا اور جس طرح سے بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی

بھرتے ہوئے کہا۔

"کلونت! قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو۔"

کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی۔ "بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں۔"

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا۔ "ہونے دے آج ظالم۔" اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کئے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا، کان کی لوؤں کو کاٹا، ابھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لئے۔ چوس چوس کر اس کا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔ لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت نہ پیدا کر سکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤں اسے یاد تھے سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیئے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر کہا "ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔

کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایشر سیاں، وہ کون حرامزادی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کے آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟"

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی "میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ چڈو ـــــ کون ہے وہ الفتی۔ کون ہے وہ چور پتا"

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا "کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں"

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا ـــ "ایشر سیاں! میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی ـــــ کھا واہگورو جی کی قسم ـــ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں ہے"

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی، قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں ـــ تکا بوٹی کر دوں گی۔ اگر تو نے جھوٹ بولا ـــ لے اب کھا واہگورو جی کی قسم ـــ کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں"

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی، لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی۔ میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر بعد نقاہت بھری آواز میں التجا کی "جانے دے اب کلونت جانے دے"

آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف تشکر بھری اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔

"میری جان! تم نے بہت جلدی کی ـــــ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے"

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا "مگر وہ کون ہے تمہاری ماں ہے"

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔"

اور میں ـــــ اور میں ـــــ کمینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں ـــــ اسی کرپان سے۔"

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔" میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ حرامزادی؟"

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا۔" گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔"

کلونت چلائی۔" میں پوچھتی ہوں وہ ہے کون؟"

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی۔" بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔" انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔"

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔" ایشر سنگھ تو مطلب کی بات کر۔"

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی

" مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں ـــــ گلا چرا ہوا ماں یا میرا ـــــ اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔"

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے ـــــ" کلونت! میری جان ـــــ میں تمھیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا ـــــ انسان گڑ بھی یا بھی ایک عجیب چیز ہے ـــــ شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا ـــــ گہنے پاتے اور روپیہ پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمھیں دے دیئے ـــــ لیکن ایک بات تمھیں نہ بتائی۔"

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا "کون سی بات ؟"

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعہ سے اڑاتے ہوئے کہا۔ "جس مکان پر ـــــ میں نے دھاوا بولا تھا ـــــ اس میں سات ـــــ اس میں سات آدمی تھے ـــــ چھے میں نے ـــــ قتل کر دیئے ـــــ اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے ـــــ چھوڑا اسے ـــــ سن ـــــ ایک لڑکی تھی بہت ہی سندر اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا۔"

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اڑایا ـــــ "کلونت جانی میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی ـــــ میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا "نہیں، ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔"

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا "ہوں"۔

"اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا ـــــ راستے میں ـــــ کیا کہہ رہا تھا میں ـــــ ہاں راستے میں ـــــ نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا ـــــ پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں" ـــــ یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا "پھر کیا ہوا ؟"

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے "میں نے ـــــ میں نے پتا پھینکا ـــــ لیکن ـــــ لیکن ـــــ"

اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا "پھر کیا ہوا ؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔" وہ ـــــ وہ مری ہوئی لاش تھی ـــــ بالکل ٹھنڈا گوشت ـــــ جانی مجھے اپنا ہاتھ دے ـــــ"

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

# بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے مجھے متعارف کرایا "منٹو صاحب بابو گوپی ناتھ سے ملیئے"

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے "بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبر ون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی کنٹی نیوٹی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ ہے نا اینٹی کی پینٹی پر؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹی۔ دھڑن تختہ، اور اینٹی کی پینٹی پر ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بہت مرعوب نظر آتا تھا "آپ ہیں بابو گوپی ناتھ، بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے

بجے تشریف لاتے ہیں ۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔"
بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔
عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا " نمبر ون بیوقوف ہوسکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں ۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں ۔ بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں ۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔"
بابو گوپی ناتھ جو خدا جانے کیا سوچ رہا تھا، چونک کر کہا " ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب " پھر سینڈو سے پوچھا " کیوں سینڈو ! کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں ؟"
عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں ۔ تو منٹو صاحب ! آج شام کو ضرور آئیے گا ۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔"
سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھ دیا ۔ جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھے بجے کے قریب پہنچ گیا ۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔
ایک تھا غفار سائیں ۔ تہمد پوش ۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں ۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا ۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا " آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ سے لعاب نکلتا ہو پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے ۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں کیوں کہ انھیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی

امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور اسکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو"۔

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام غلام علی تھا۔ لمبا تڑنگا جوان۔ کسرتی بدن۔ منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا "یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹیاں ملائی گئیں، اس کو پھانسنے کے لئے مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی۔ میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے"۔

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد اٹھڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا "زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے ـــــ دھڑن تختہ!"

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی ٹپک رہی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ

کیا اور سینڈو سے کہا: "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: "جناب یہ ہے ٹین ٹپوٹی۔ فل فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم۔ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپیہ کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا "بکواس نہ کر۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا: "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا: "برائے وسکی اینڈ سوڈا ـــــ بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سنبرے کو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کیا۔ سینڈو نے ایک نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا "اوگوڈ ـــــ اور رب العالمین ـــــ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ـــــ جاؤ بھی غلام علی دو بوتلیں جانی واکر اسٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا ـــــ دھڑن تختہ منٹو صاحب وسکی تو ایسی حلق سے اتر کر پیٹ میں

انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ـــــ جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔"

بابو گوپی ناتھ بیچارہ خاموش رہا کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا تھا: "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ ـــــ"

وہ چونک پڑا "جی میں ـــــ میں ـــــ کچھ نہیں۔" میں کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی: "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں ـــــ اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔"

سینڈو نے کہا: "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں ـــــ لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹی نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا: "اب کہاں میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ لون ڈیرہ دار تھی؟ کون مٹنی تھی؟ نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار سینڈو۔ غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے ٹھگوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وہسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر کسی دلچسپی کے۔

سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں ہے لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پیئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی، اس کا پتہ مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیوں کہ اسے مارفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین بیگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: "منٹو صاحب! میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا "بڑا نیک خیال ہے۔" بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ "منٹو صاحب یہ بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جان من! مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا معلوم ہے آپ کو؟ ——— کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے ——— منٹو صاحب! موٹر کتنے میں آجائے گی؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا "کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب ——— آپ کو اور کار کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ۔ زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھ ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہئے۔"

زینت کا چہرہ ردعمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا ـــــ "منٹو صاحب! آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں۔ لیکن آپ مجھے بنا لیجیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سیندھو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا۔ چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا ـــــ بہت گنہ گار آدمی ہوں ـــــ دسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟"

میں نے کہا "نہیں نہیں ـــــ بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا "اور لیجئے منٹو صاحب!" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندہ نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے "سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا اس کا کیا ہوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا تھا لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا "منٹو صاحب! اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا یا ـــــ"

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر بولا "جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھے ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بعد

دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے، غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں لیکن میں انھیں عقلمند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بیوقوفی کو شناخت کر لیا جن سے ان کا الّو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں کسی ایک کے مزار پہ چلا جاؤں گا۔"

میں نے پوچھا "رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا "اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر عرش تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟"

میں نے ایک اور سوال کیا "آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے۔ کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیوں کہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ـــــ منٹو صاحب! مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جولیب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔"

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنیے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبے آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت وہ میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ

تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لئے پسند نہیں تھی اس میں طوائفوں کے عشوے اور غمزے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا، عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے، خاص طور پر جو پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت میں جس میں میراثنوں کے مزاج کی جھلک تھی بہت جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتاً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں سے صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثنوں کے لطیفے سنا رہا تھا جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا "ادبسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے"

سینڈو نے کہا "تشریف لے آئیے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں

آپس میں ٹکرا کر کچھ اور کبھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤں پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی کم گو۔ سادہ لوح صاف ستھری۔ شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ کچھ یوں کہئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیوں کہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور وہ روتی روتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا۔ لیکن میں نے مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آیئے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگڑی پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا "منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زاید پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے یہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے

والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو۔ جو کچھ وہ کرتی ہیں، سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹریس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لاتے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھا دے۔ غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا "تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ___ منٹو صاحب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ بھی تیز ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بینک میں دس ہزار روپیہ جمع کرنے کو تیار ہوں مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہو گی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی۔ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے سردار اسے ہر شام اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟"

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا۔

"اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوب صورت بھی۔ کیوں زینو جانی ___ پسند ہے تمہیں؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ

جکڑا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹریس بنانے کے لئے اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلی فون لگوا دیا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا: "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے لیکن بیچاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ درست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اسے تلاش کیا۔ لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا: "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے

لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے ـــــــ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پیٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں۔ کیوں کہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گذر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں نہ جانے کس کام سے ہارنبی روڈ پر جا رہا تھا۔ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ـــــــ اچھی لڑکی ہے یار۔" یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرایا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی نے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیوں کہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یٰسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گذر جائیں، زینت اور یٰسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا

جائے ـــــ مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل سے لیسین کی آنکھ لڑ گئی چنانچہ زینت بیچاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور لیسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب! یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ ابھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی۔ میاں اگر تم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ـــــ میں کیا کروں منٹو صاحب۔ بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ـــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ـــــ تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔"

لیسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی۔ ایک دن ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے روپے کا بندوبست کرنے کیوں کہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیوں کہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مارفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن لکھن کی، چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لاتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہیے۔ سوا سو روپے روز کے ہو جاتے ہیں جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار بانٹ لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

اس نے بڑے اطمینان سے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، مان لیتی ہوں۔"

جی چاہا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے تمھیں بھی بیچ ڈالیں گے مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ اور بے امنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہ تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگرٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلی فون سے، حتیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ماہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈو"

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اس قدر نکلا ——

"دھڑن تختہ"

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا "آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو" لیکن سینڈو نے کہا "ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجئے، مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا۔

دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا "واپس لے چلو"۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا "منٹو صاحب! زینو کی شادی ہونے والی ہے"۔

میں نے حیرت سے پوچھا "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا "حیدر آباد سندھ کا ایک دولت مند زمین دار ہے۔ خدا کرے دونوں خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ـــــ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت اس سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل ع نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ بٹھا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی طرح وہ زینت کے دوست کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کو خوشی دوفی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا "منٹو صاحب! خوبصورت، جوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور میں جا کر دعا مانگی تھی، جو قبول ہوئی ـــــ بھگوان کرے

دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

محمد شفیق طوسی، محمد یٰسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دولھن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب وقبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا۔" دھڑن تختہ۔"

غلام حسین سرج کا نیا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے سامنے چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے انداز میں کہا۔" منٹو صاحب ذرا اندر جایئے اور دیکھئے زینو دلھن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی — دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی تھی۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا بہت پیاری لگی۔ جب میں نے دوسرے کمرے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول سجے تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا " یہ کیا مسخرہ پن ہے۔"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔" آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!" اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار

کے ساتھ اس نے اپنے رومال سے زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا" منٹو صاحب! میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں ـــــ زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت، جو اسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا" خدا تمھیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی ـــــ بہت ہی دکھ بھری ملامت ـــــ اور چلا گیا۔

# کھول دو

امرتسر سے اسپشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے ـــــ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے، اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے ـــــ مگر اس کے ہوتے حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں ـــــ لوٹ، آگ، بھاگم بھاگ، اسٹیشن، گولیاں، رات اور سکینہ! سراج الدین اک دم کھڑا ہوگیا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ سکینہ سکینہ پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی

بیٹی کا کوئی پتہ نہیں ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔ سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے وہ اور بڑھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا "مجھے چھوڑو اور سکینہ کو لے کر فوراً ہی یہاں سے بھاگ جاؤ"؟

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا لیکن سکینہ نے چلا کر کہا تھا "ابا جی چھوڑیئے"۔ لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ـــــ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا۔ سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا ـــــ لیکن سکینہ یہاں کہاں تھی؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی؟ راستے میں جب وہ گاڑی رکی ہوئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے؟

سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے جواب کوئی نہیں تھا۔ اس کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج الدین نے رونا چاہا مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھے روز کے بعد ہوش و حواس کسی طرح درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے ۔ آٹھ نوجوان تھے جن کے پاس لاری تھی ، بندوقیں تھیں ۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا "گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت ۔ مجھ پر نہیں تھی اپنی ماں پر تھی ۔ عمر سترہ برس کے قریب ہے ۔ آنکھیں بڑی بڑی بال سیاہ ، داہنے گال پر موٹا سا تل ـــــ میری اکلوتی لڑکی ہے ۔ ڈھونڈ لاؤ ، خدا تمھارا بھلا کرے گا ۔"

رضا کار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہو گی ۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی ۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ امرتسر گئے ۔ کئی عورتوں ، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا ۔ دس روز گذر گئے مگر انھیں سکینہ کہیں نہیں ملی ۔

ایک روز وہ اسی خدمت کے لئے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھہرٹے کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی ۔ لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کر دیا ۔ رضا کاروں نے موٹر روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے ۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا ۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی ۔ داہنے گال پر موٹا تل تھا ۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا "گھبراؤ نہیں ـــــ کیا تمھارا نام سکینہ ہے ؟" لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا ۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا ۔ لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے ۔

آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی ، اسے کھانا کھلایا ، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا ۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی اور بار بار باہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی ۔

کئی دن گذر گئے ـــــ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہا لیکن کہیں بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتا رہتا جنھوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

ایک دن سراج الدین نے کیمپ میں ان رضا کار نوجوانوں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے۔ سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا۔ "بیٹا! میری سکینہ کا پتہ چلا؟"

سب نے ایک زبان ہو کر کہا "چل جائے گا۔ چل جائے گا" اور لاری چلا دی۔

سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کی دعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

شام کے قریب جہاں کیمپ میں سراج الدین بیٹھا تھا اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ ہوئی۔ چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی۔ لوگ اسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کر دیا اور چلے گئے۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا "سکینہ!"

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا "کیا ہے؟"

سراج الدین کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا "جی میں ـــــ جی میں اس کا باپ ہوں۔"

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا اور اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا: "کھڑکی کھول دو۔"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خاموشی سے چلایا: "زندہ ہے ـــــ میری بیٹی زندہ ہے۔"

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔

# ممّی

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممّی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا۔ اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی ہے۔

وہ پونا میں کیسے آئی۔ کب سے وہاں تھی۔ اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ وہ پونا کے ہر ذرے سے وابستہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو۔ مگر پونا میرے لئے وہی پونا تھا اور اس کے وہی ذرے۔ اس کے تمام ذرّے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں ـــــ اور ممّی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری ملاقات پونے ہی میں ہوئی ـــــ میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں۔ آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھیں گے کہ کنچن چنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی اور چوٹی کو سر کرنے کے لئے نکل جانے

والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونے گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے ہوئے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں ـــــ ٹھہریئے میں حساب لگا لوں ـــــ آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آٹھ برس سے میں بمبئی میں تھا مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونا جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لئے پونا ہو آؤں۔ وہ بھی اس لئے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم ٹانگہ لے چکے تھے۔ سست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی۔ تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکّوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گرد سے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہوگا، جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا ـــــ دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا ایک ٹانگہ گذرا میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا "اوئے منٹو کے گھوڑے!"

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ ـــــ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردعمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں، پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اس قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا۔ مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ میری ساری بے تکلفی جھریاں جھریاں ہوگئیں۔

میں نے اپنا تانگہ رکوا لیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھیر جائے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا "ممی جسٹ اے منٹ۔" تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا ـــــ "تم ـــــ یہاں کیسے آئے؟" پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا "بھابی جان ـــــ آپ نے کمال کر دیا ـــــ اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔"

میں نے اس سے پوچھا "تم جا کہاں رہے ہو؟"

چڈے نے اونچے سروں میں کہا "ایک کام سے جا رہا ہوں۔ تم ایسا کرو، سیدھے ـــــ" وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا "دیکھو صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ۔ کرایہ ورایہ مت لینا ان سے" ـــــ ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نبٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا "تم جاؤ۔ نوکر وہاں ہو گا ـــــ باقی تم دیکھ لینا۔"

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے میں آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا ۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ٹوٹا پھوٹا اک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا ”چلیئے صاحب !“

میں نے پوچھا ”کہاں ؟“

اس نے جواب دیا ”چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے“

”اوہ“ میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیئے تو وہ پونا ہی کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ تکدر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس لئے دن رات اڑے گی ---- میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا، وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا ”چلو“

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا تھا۔ تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہو سکتا ہے، جو فلموں کا ہیرو ہو اور ایسی کمپنی کا ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے اور وہ بھی کئی قسطوں میں ۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو میری بیوی ہو، ایسے گندے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے یہ سوچا تھا کہ چڈہ آجائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے ۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بال بچے بھی تھے وہاں کے ماحول میں میری ۔ درویش برجان درویش دو تین دن گذار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب ۔ لاابالی آدمی تھا جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے

تھے، وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوکر دیکھے بغیر پاس سے گذر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے۔ پر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذاتِ شریف چڈہ کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا۔ "رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے معلوم نہیں کدھر گئے۔"

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا۔"کیا آپ اس میں تیل لینے جارہے ہیں؟"

تیل لینے جانا بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا۔"نہیں صاحب —— میں —— تپاس کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔"

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا کہ جیسے وہی اس کی جگہ تھی۔ اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطرداری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔" دیٹ از دیٹ —— تو تم آ گئے اولڈ بوائے —— چلو ذرا اسٹوڈیو تک

ہو آئیں، تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی ـــــ آج شام کو ـــــ میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ "بھابی جان کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا۔" اور پھر زور سے ہنسا۔ "مولویوں کی ایسی تیسی، اٹھو منٹو۔ بھابی جان یہاں بیٹھی ہیں۔ ہم ابھی آجائیں گے۔"

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہولیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کے چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کئے۔ اور ہم پون گھنٹے میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالمگی اختیار کر گئی تھیں۔

ہر شے گرد آلود تھی اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا۔ جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی برہیمی فضا کی تکمیل کے لئے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا، اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا ـــــ "چین کے شہزادے! ـــــ دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ ـــــ میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی اور نصف درجن گلاس۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں دنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آجاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا اس وقت کا چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے اسپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس رم کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا۔ "ویٹ از ویٹ ـــــ تو آفٹر آل تم ادھر آہی نکلے ـــــ" لیکن ایک دم متفکر ہو گیا ـــــ "یار بھابی کا کیا ہو ـــــ وہ تو گھبرا جائے گی۔"

چڈہ بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو میں فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں، ساری تیاری کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں۔"

رم فوراً ہی آگئی اور گلاس بھی۔ چڈے نے چھ منگوائے تھے اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے۔ چڈے نے ان کی کوئی پروا نہ کی، اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا "تمھارے پونے آنے کی خوشی میں۔"

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیئے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا "میں شور کرتا ہوں ان کی نیند کھل جائے گی ـــــ پھر ایسا کریں گے ـــــ ٹھیرو ـــــ میں پہلے چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی "جمیکا کے شہزادے۔"

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آگیا۔ چڈے نے اس سے کہا "دیکھو ممی سے کہو۔ ایک دم فرسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے ـــــ ایک دم۔"

نوکر چلا گیا۔ چڈے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا "میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمھارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آگئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرت کا اظہار کیا۔

"ممی آزاے جیول ——!" پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا۔ "آؤ"۔

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چیڈے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا۔ "حاضر ہے بیگم صاحب!"

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا اس لئے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں۔"

میں نے جواب دیا مگر چیڈے نے جھک کر بڑے ایماندارانہ طور پر کہا۔ "جی ہاں یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔"

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھلکھلا کے ہنسا۔ "ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سور ہیں جن پر ہر حرام شے حلال ہے —— چلئے اب ہم آپ کو مسجد تک چھوڑ آئیں۔"

میری بیوی کو پھر چیڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چیڈے ہی سے نفرت تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چیڈہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا۔ اس لئے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود کو بھی پھاند جاتا تھا۔ مگر چیڈے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی [illegible] سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے چلے ہوئے تیوروں کو [illegible] بشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی "کبابستان کے شہزادے —— ایک عدد ٹانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔"

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چیڈہ۔ وہ غالباً دوسرے کمرے میں گیا تھا۔ تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آ ہی جایا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لئے سب سے

اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گذر جانے دیا جائے لیکن حسب معمول اس نے میری کنفیوشسانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا ٹانگہ لے کر آیا۔ ہم بھارت نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی۔ چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا "خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے۔ یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "چلو منٹو اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑ لیں۔"

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچایا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ ٹانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا "یہ تو ہو گیا ـــــ اب کیا پروگرام ہے" پھر کھلکھلا کر ہنسا "ممی ـــــ گریٹ ممی!"

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا۔ یہ ممی کس توتنخ آمون کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹج تھا، مگر چڈہ اس کو کبیدہ کاٹج کہتا تھا۔ اس لئے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹج میں کافی آدمی رہتے تھے۔ حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اس فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائرکٹر، کوئی اس کا نائب در نائب۔ ہر دوسرا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے

لئے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار سے ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں بھی جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں، یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے، ورنہ سٹہ۔ جیتتے شاذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ بہت کم تھی اس لئے موٹر گراج بھی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی۔ شیریں نام کی ایک عورت تھی، جس کا خاوند شاید یکسانیت توڑنے کے لئے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا معلوم نہیں وہ کب آتا تھا ـــــ اور کب جاتا تھا، کیوں کہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معزز حصہ چڑھ اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا۔ یہ دونوں بھی ہیرو تھے مگر ہیرو نہیں تھے۔ ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رغبت کمار تھا۔ چڑھ کہا کرتا تھا۔ "سعیدہ کاٹیج اس خرذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا۔" خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڑھ کبھی کبھی اسے کھوا کہا کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لئے تھے، وہ بھی چڑھ کے لئے کہ اس پر ایک خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائیگی لازم ہو گئی تھی۔ "ادب لطیف" قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں

اس کا شغل تھا کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے اسسٹنٹ تھے۔ اور بر عکس نہند نام زنگی کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین، یعنی چڈھ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گیراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کاٹیج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے، وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ کبھی بازار سے اس کا سودا سلف لا دیا، کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے۔ اور کبھی اس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہیں تھا۔ سب کے سب مسرور تھے۔ شاید اپنی کبیدگی پر وہ اپنے حالات کی نامساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کاٹیج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز باہر آ رہے تھے چڈھے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیئے اور کہا "چار تولیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجئے۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔"

غریب نواز کے حیدر آبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈھ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا: "یہ مسٹر دن ٹو ہیں ——— لیکن ان سے مفصل بات کرنے کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پیتے ہیں۔ شام کو اسکاچ

آجائے تو ـــــ لیکن آپ جائیے۔

غریب نواز چلا گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی ا
رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار کا سرسری انداز
کیا اور نوکر کو آواز دی " قراقستان کے شہزادے " جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے
گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا " زیادہ پی گیا ہے کمبخت!"

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکرمند ہو گیا " یار، بھابی کو تم خواہ مخواہ یہاں لائے
خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔ پھر اس نے خود ہی اپنے کو تسکین
دی " لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوں گی وہاں "

میں نے کہا " ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی " اور میں
اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ بسے ہوئے گڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے با
کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ ادھر کسی نے بآواز بلند چڈہ کا نام لے کر پکارا۔ میں چونک پڑا
دیکھا کہ میوزک ڈائرکٹر رن کتے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے
حبشی ہے، آریہ ہے یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کسی خدوخال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر
پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آجاتا کہ فوراً ہی نئے سر
سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا مگر شیواجی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے
چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان
سروں کے لئے بہت ضروری تھی جن کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے
دیکھا تو چلایا " منٹو ـــــ منٹو سیٹھ!"

چڈے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا " سیٹھ کی ایسی تیسی ـــــ چل اندر آ
وہ فوراً اندر گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہنستے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپا

رکھ دی۔" میں سالا ادھر ممی کے پاس گیا۔ وہ بولا "تمھارا فرینڈ آئے لا ـــ میں بولا
ا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے۔ سالا مالوم نہ تھا سالا منٹو ہے۔"

چیڈے نے ون کترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی "اب چپ کر سالے کے۔
م لے آیا ـــ بس ٹھیک ہے۔" ون کترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے
ہ پیگ تیار کیا۔" منٹو ـــ یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے ـــ
، ایک دم کرڑ کا ـــ سوچا کیا کروں ـــ"

چیڈے نے ایک اور دھپا اس کے سر پر جمایا۔" بیٹھ بے، جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔"

"سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا ـــ تیرے باپ نے دیا مجھ کو۔"
، کترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چیڈے نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور
، سے پوچھا۔" تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی ـــ بولی تھی؟"

"مرزیل کب آئے گی؟ ـــ ارے ہاں ـــ وہ پلیٹینم بلونڈ!"

ون کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چیڈے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا۔
منٹو ـــ خدا کی قسم کیا چیز ہے ـــ سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹنم بلونڈ بھی ہوتی
ہ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا ـــ بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار ـــ گریٹ
ـــ خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ ـــ ممی زندہ باد!" ـــ پھر اس نے قہر آلود نگاہوں
ے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا "کن کترے کے بچے ـــ نعرہ کیوں نہیں
اتا ـــ ممی زندہ باد!"

چیڈے اور وَن کُترے دونوں نے مل کر "ممی زندہ باد" کے کئی نعرے لگائے۔
ں کے بعد ون کترے نے چیڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اس نے اسے خاموش
دیا" چھوڑو یار ـــ میں جذباتی ہو گیا ہوں ـــ اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام
ر پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں، جنھیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے ـــ

مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہوگیا ہے ـــــ" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔" منٹو ـــــ بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں ـــــ چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا ـــــ معلوم نہیں پلیٹنم کا رنگ کیسا ہوتا ہے، کیوں کہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی ـــــ کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے ـــــ فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے ـــــ"

وان کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔" اور اس میں تھوڑی سی ایکس رم مکس کر دی جائے چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی ـــــ" بکواس نہ کر" ـــــ یہ اس نے بڑی رحم انگیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔" یار ـــــ میں واقعی جذباتی ہوگیا ہوں۔ ـــــ ہاں ـــــ وہ رنگ ـــــ خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے ـــــ وہ تم نے دیکھا ہے ـــــ وہ جو مچھلیوں کے پیٹ پر ہوتا ہے ـــــ نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے ـــــ پومفریٹ مچھلی ـــــ اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟ ـــــ نہیں نہیں ـــــ سانپوں کے ـــــ وہ ننھے ننھے کھپرے ـــــ ہاں کھپرے ـــــ بس ان کا رنگ ـــــ کھپرے ـــــ یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا ـــــ اتنی خوبصورت چیز اور ایسا واہیات نام ـــــ پنجابی میں ہم انھیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چنچناہٹ ہے ـــــ وہی ـــــ بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے ـــــ لٹیں ننھی ننھی سپنولیا معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں ـــــ" وہ ایک دم اٹھا۔ سپنولیوں کی ایسی تیسی، میں جذباتی ہوگیا ہوں۔

وان کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا۔" وہ کیا ہوتا ہے؟"

چڈے نے جواب دیا۔" سنٹی منٹل ـــــ لیکن تو کیا سمجھے گا، بالاجی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی اولاد۔"

وان کترے نے اپنے لئے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔" یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے، میں انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹری کولیٹ ہوں ـــــ سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے ـــــ اس نے ـــــ"

چڈے نے چڑ کر کہا: "اس نے تجھے تان سین بنا دیا ۔۔۔ تیری ناک مروڑی کہ نکوڑے سُر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں ۔۔۔ بچپن ہی میں اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا ۔ اور دودھ پینے کے لئے تو میاں کی توڑی میں رویا کرتا تھا اور پیشاب کرتے وقت اُڑانہ میں ۔۔۔ اور تو نے پہلی بات پٹ دیپکی میں کی تھی اور تیرا باپ جگت استاد تھا ۔ بجو باوَرے کے بھی کان کاٹتا تھا ۔۔۔ اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے ، اسی لئے تیرا نام کن کترے ہے ۔" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "منٹو ! یہ سالا ۔۔۔ جب بھی پیتا ہے ۔ اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے ۔۔۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا ۔ اور اس نے اسے میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ایف بی ۔ اے ۔ کی ڈگری پھاڑ کے پھینک دوں ۔"

وان کترے نے اس بوچھاڑ کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اس کو وہیں روک دیا ۔ "چپ رہو ۔۔۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں سنٹی منٹل ہو گیا ہوں ۔۔۔ ہاں وہ رنگ ۔۔۔ یوسف پٹ بھیلی کے ۔۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ سانپ کے ننھے ننھے کھپرے ۔۔۔ بس انہی کا رنگ ۔۔۔ مجھے خدا معلوم ایسی بین یہ کون سا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا ۔"

وان کترے سوچنے لگا : "بین منگاؤ ، میں بجاتا ہوں ۔"

چڈہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا : "بیٹھ بے میٹریکولیٹ کے چاکولیٹ ۔"

اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا "منٹو ! اگر یہ پینٹر نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا ۔" اور اس نے گلاس خالی کر دیا ۔

وان کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی : "منٹو ! ٹلگی ایک دم جانگلی ہے ۔"

میں نے کہا : "دیکھ لیں گے ۔"

"آج ہی ۔۔۔ آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں ۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے

اور شری ایک سو ساٹھ مہتا جی نے تمھاری وجہ سے وہ ایڈوانس دے دیا، ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی
آج کی رات ـــــ آج کی رات ـــــ" چڈے نے بڑے بھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا۔

"آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ"

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔ دونوں کے پاس اسکاچ کی دو بوتلیں تھیں۔ یہ انھوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے۔ مگر بے تکلف نہیں۔ اس لئے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس پلیٹینم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پیگ پیئے تھے۔ نشے کے معاملے میں ان سب کی سطح اب ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لئے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بری طرح فریفتہ تھے جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب والے کا نام فی لس تھا۔ پونے میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدر آباد میں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر بھی اس داؤں پر لگانے کے لئے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا، اپنا قبول صورت ہونا۔ ون کترے کا بزعم خود یہ خیال تھا کہ اس کی پیٹی سن کر وہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا ـــــ لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھئے ممی کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹینم بلونڈ فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ

تانگے میں دیکھا تھا کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

نی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا "جہنم میں جائے یہ لونڈیا ــــ چلو یار ــــ بھابی وہاں کباب ہو رہی ہو گی ــــ لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی منٹل نہ ہو جاؤں ــــ خیر ــــ تم مجھے سنبھال لینا۔" اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی "ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے۔"

ممیوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا۔ جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کھاد کے باہر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا۔ "دو عدد ٹانگے لاؤ ــــ جو مصری رتھ معلوم ہوں۔"

ٹانگے آ گئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے ــــ میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر ہی موجود تھا۔ اس دور دراز جگہ پر بھی اس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا۔ چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیض و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تھا۔ بڑی پرلطف باتیں کیں۔ اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ ــــ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا "کون گانا فلما رہے ہیں آپ؟"

ہریش نے جواب دیا "جی نہیں ــــ وہ کل کا پروگرام ہے۔ میرا خیال ہے آپ کل چلئے گا۔"

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا "ہاں کل ٹھیک رہے گا ــــ آج تو انھیں سفر کی تھکن بھی ہے۔"

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پرلطف باتیں کیں۔ آخر مجھ سے کہا۔" چلو یار ــــ تم چلو میرے ساتھ۔" اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا "ان کو چھوڑو ــــ سیٹھ صاحب تمھاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔"

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا۔" ان سے اجازت لے لو۔"

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا۔" میں نے بمبے سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکیومنٹ کیس ساتھ لے چلیے۔ پر انھوں نے کہا کوئی ضرورت نہیں ــــ اب یہ کہانی کیا سنائیں گے؟"

ہریش نے کہا" زبانی سنا دے گا۔" پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہے کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا" ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔"

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا۔" تو بھئی ہم چلتے ہیں۔" وہ تینوں اٹھ کر سلام نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے ــــ پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا۔" راجا ہریش چندر زندہ باد!"

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی سہیلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹیج تھی شکل و صورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی، مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتہ چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہوگا، مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے۔ لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی تو میں نے سوچا کہ گرد و پیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں بہت برسوں کی

ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہوگئی ہے اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں —— ان کی جو عمر تھی وہ وہیں کی وہیں رہی ہے —— لیکن جب میں نے اس کے گھرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کبھی اپنے گردوپیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ و متین طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممی کے متعلق مجھ سے کہا: "یہ ممی ہے —— دی گریٹ ممی"

ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔ اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا: "تم نے چائے منگوائی تھی۔ حسبِ معمول نہایت افراتفری میں —— معلوم نہیں انھیں پسند بھی آئی ہوگی یا نہیں:" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی "مسٹر منٹو، میں بہت شرمندہ ہوں اصل میں سارا قصور تمھارے دوست چڈے کا ہے —— جو میرا ناقابلِ اصلاح لڑکا ہے:"

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا: "رات کا کھانا تیار ہے —— یہ میں نے اس لیے کیا کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے ——"

چڈے نے ممی کو گلے سے لگالیا: "یو آر اے جیول ممی —— یہ کھانا اب ہم کھائیں گے:"

ممی نے چونک کر پوچھا "کیا؟ —— نہیں ہرگز نہیں:"

چڈے نے اسے بتایا: "مسٹر منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں:"

ممی چلائی "خدا تمھیں غارت کرے —— یہ تم نے کیا کیا؟"

چڈہ کھلکھلا کر ہنسا "آج پارٹی جو ہونے والی تھی:"

"وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی:" اور ممی نے اپنا سگریٹ سلگایا۔

چڈے کا دل ڈوب گیا۔ "خدا اب تمھیں غارت کرے ـــــ اور یہ سب پلین ہم نے صرف اس پارٹی کے لئے بنایا تھا۔ وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے کے ہر ذرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "لو سارے خواب ملیامیٹ ہو گئے ـــــ پلیٹی نم بلونڈ ـــــ اودھے سانپ کے ننھے ننھے کھپروں جیسے رنگ والے بال ـــــ" ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ "کینسل کی تھی ـــــ اپنے دل میں کینسل کی تھی ـــــ لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں۔" اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور باآواز بلند پکارا "ہرے!"

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی شفقت سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا۔ "جنرل ون کترے ـــــ جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری توپیں لے آؤ۔" ون کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ سعیدہ کا ٹیچ بالکل پاس تھی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ توپیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اس کے چڈے کا نوکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا۔ "آؤ۔ آؤ ـــــ میرے کوہ قاف کے شہزادے ـــــ وہ ـــــ وہ سانپ کے کھپروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہے ـــــ تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔"

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چڈے کی بہت بیہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انھوں نے بہت محسوس کیا تھا۔ چڈہ حسب عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں غریب نواز، رنجیت کمار اور چڈہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کنلونے لینے گئی ہے۔

یہ سب منتظر ہیں۔ چڈھ مطمئن ہے کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا، اس لئے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے ـــــ شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ اس کا تصور ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا ـــــ ہر فضا، ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے ـــــ اس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس میں کوئی سراشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شے، ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابل فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ مجھے بار بار ستا رہی تھی وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھریوں کی توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے۔ غریب نواز اور ون کرتے کے لئے موجود ہے ـــــ اور خدا معلوم اور کس کس کے لئے ـــــ

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا "یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے؟"

اس لئے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے ـــــ تمہارے اور میرے جیسے الو اس دنیا میں بہت کم ملتے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے اور ـــــ اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں نہیں کرتے ـــــ ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں، الو کے پٹھے ہیں ـــــ میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں ـــــ بیساکھی کا میلہ تھا ـــــ تمہارے امرتسر میں ـــــ رام باغ کے اس بازار میں جہاں مٹھیائیاں رہتی ہیں ـــــ جاٹ گذر رہے تھے ـــــ ایک صحت مند جوان نے ـــــ خالص دودھ اور مکھن پیلے ہوئے جوان نے، جس کی نئی

جوتی اس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی۔ اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت واہیات رنگوں میں لپی پتی ایک سیاہ فام ٹکھیائی کی طرف دیکھا جس کی تیل میں چپڑی ہوئی بہریاں اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹہوکا دے کر کہا ـــــ ادئے لغا تیاں ـــــ وتّخ ادے اوپر وتخ ـــــ اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای ـــــ" آخری لفظ وہ خدا معلوم کیوں گول کر گیا حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھلکھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا ـــــ "اس جاٹ کے لئے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ قاف کی پری تھی ـــــ اور اس کے گاؤں کی حسین وجمیل مٹیاریں، بے ڈول بھینس ـــــ ہم سب چغد ہیں ـــــ درمیانے درجے کے ـــــ اس لئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اول درجے کی نہیں ـــــ تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی ـــــ لیکن ـــــ لیکن ـــــ فی لس خاص الخاص درجے کی چیز ہے ـــــ وہ سانپ کے کھپروں ـــــ"

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا "کھپرے ـــــ کھپرے ـــــ تمھارا مستک پھر گیا ہے ـــــ"

چڈے نے ماتھے پر سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیئے اور ون کترے سے کہا "لے اب سنا ـــــ تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا ـــــ میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے!"

ون کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا "بائی گاڈ ـــــ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا ـــــ میں نفٹین ایرز کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی۔"

چڈہ زور سے ہنسا "تمھیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے ـــــ بھگوان اسے سورگ میں کیسٹرل کی بیٹی دے کہ وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمھاری شادی کے لئے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈتا رہے۔"

دن کترے اور کبھی سنجیدہ ہو گیا۔" نٹو ـــــ میں جھوٹ نہیں کہتا ـــــ میری وائف اکدم بیوٹی فل ہے ـــــ ہماری فیملی میں ـــــ"

"تمھاری فیملی کی ایسی تیسی ـــــ فی لس کی بات کرو ـــــ اس سے زیادہ اور کوئی خوب صورت نہیں ہو سکتا۔" چیڈے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے۔ "گن باؤڈر پلوٹ کے بانیو ـــــ سن لو تمھاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی ـــــ میدان چیڈے کے ہاتھ رہے گا ـــــ کیوں ویلز کے شہزادے؟"

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چیڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔

غریب نواز اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کے باتیں تو کر رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیٰحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے کیوں کہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چیڈہ مجھ سے بمبے کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چیڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط والوں کی۔ پولی، ڈورلی، کٹی، ایلما اور تھیلما ـــــ اور وہ ہیجڑا نما لڑکا ـــــ اس کو چیڈہ سسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ چیڈے کے ساتھ تھی۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹینم بلونڈ کی پتلی کمر میں حمائل تھا۔

میں نے غریب نواز اور رنجیت کمار کا ردعمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ نمائشی فتمندانہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور بپا ہوگیا۔ ایک دم آتنی انگریزی برسی کہ دن کٹرے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ناکت اور تا تکتھئی تھئی کی دن، ٹو، تھری بتا بتا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا اور ادھر چڈہ باقی لڑکیوں کے جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے ملرک سنا رہا تھا، جو اس کو بے شمار کی تعداد میں زبانی یاد تھے ـــــ ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت کمار سگرٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے اپنے پلیٹنمی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ چڈے نے بددلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لئے ایک ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا "بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ۔"

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہوگیا اور اس نے اس خوشی میں بیس پچیس اور ملرک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے ـــــ میں نے سوچا عریانی سے تنگ آکر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردعمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکشا پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے مسلسل ایک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لئے نجات مل جاتی ہے

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش جوان لڑکیوں میں گھلی ملی چیڈ ٹے کے ننگے ننگے ملر کی سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھرّیاں صاف نظر آرہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھیں میں نے سوچا، آخر لوگ کیوں فراڈ کو برا سمجھتے ہیں ـــــ وہ فراڈ جو میری آنکھوں کے سامنے تھا، اس کا ظاہر گو بدنما تھا، لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا ـــــ اس پر کوئی بناؤ سنگھار، کوئی غازہ کوئی ابٹنا نہیں تھا۔

پولی تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرالی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بے کار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے ـــــ اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یک مشت ملنے کی ہرگز ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی، وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کئے جا رہا تھا۔ تھیلما، ون کترے سے تانڈیو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے۔ مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کٹی دونوں پیئے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آئوی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ لگا دی تھی اور جیڈہ فی لس کے سانپ کے کھپرے ایسے رنگ کے بالوں کو

پگھلے ہوئے سونے کے رنگ کی اس کانچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ نی لس کا ہیجڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی، کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی ـــــ اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کئے سستاتی ہے مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا؟ ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔ غالب کہتا ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ـــــ اس نجات کے لئے کون ملک الموت کا انتظار کرے ـــــ کیوں آدمی چند لمحوں کے لئے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لئے ممتا تھی ـــــ میں نے سوچا۔ شاید اس لئے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو ـــــ اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی ـــــ اس نے اپنی شفقت اور محبت کے لئے چند آدمی چن لئے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ جیڈہ ایک گھڑا اگھ نی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے نہیں سب کے سامنے، مگر ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی ـــــ نی لس

نشے میں تھی، ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کئے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ون کترے تھیلما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے بتلا رہا تھا کہ اس کا باپ سالا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ جا ئلڈ ہڈ ہی میں اس نے اس کی شادی بنا دی تھی۔ اس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے۔ اور غریب نواز ڈولی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں۔ تپائی کے ارد گرد فی لس اس کا ہیجڑہ نما ساتھی اور ممی بیٹھے تھے۔ چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا ـــــ اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا۔ غریب نواز اور ایلما اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی ہارٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں ـــــ ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر تھیلما کی طرف جو اس کے پاس بیٹھی تھی اور اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لئے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بد زبانی کرنے لگا۔ فی لس نے دونوں میں مصالحت کی مہین مہین کوشش کی، مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ حیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آئے، مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی

سے کہہ رہا تھا "تم دیوانی ہو گئی ہو ـــــ بوڑھی دلالہ ـــــ فی لس میری ہے ـــــ پوچھ لو اس سے"۔

ممی نے بڑی دیر تک اس کی گالیاں سنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا ـــــ "چیدہ مائی سن ـــــ تم کیوں نہیں سمجھتے ـــــ شی از ینگ ـــــ شی از ویری ینگ"۔

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی، ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی۔ مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس اور اس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ بمشکل پندرہ برس کی ـــــ اس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے پہلے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

چڈے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا ـــــ ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی ـــــ چڈہ چھوڑ دو ـــــ فور گوڈز سیک ـــــ چھوڑ دو اسے"۔

جب چڈے نے فی لس کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا ـــــ "گٹ آؤٹ ـــــ گٹ آؤٹ!"

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا گیا۔

سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون قمیص اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑی میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز

سنی جو گراج سے باہر آرہی تھی۔ میں رک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا "وہ لاجواب عورت ہے ـــــ خدا کی قسم وہ لاجواب عورت ہے ـــــ دعا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی کریٹ ہو جاؤ"

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی ـــــ معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا ـــــ میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے اس کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں برکھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا۔ ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونے میں کافی تفریح ہو گئی تھی اس لئے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ رسماً اس نے ہمیں روکنا چاہا، مگر میں سعیدہ کا بیچ ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لئے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی تھا۔

ہم چل دیئے ـــــ راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا، میں نے اس کو من و عن سنا دیا۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ فی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہو گی یا وہ اسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی جبھی اس نے چڈے سے لڑائی کی ـــــ میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گذرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا۔ اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا "میں اس روز حیوان بن گیا تھا ـــــ لعنت ہو مجھ پر"

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کا بیچ پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ گراج سے باہر نکل کر شیریں کے خورد سال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے

بعد رنجیت کمار آ گیا ۔ کچھوے کی چال چلتا اور خاموش بیٹھ گیا ۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا ۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چیڑو اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے ۔ نی نس کر اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا تھا ۔ وہ اس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی ۔

رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونے میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اڑتا ۔ غریب نواز کو ایسا کوئی غم نہیں تھا ۔ اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی ۔

چیڑے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے ۔ بخار رہتا ہے مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا ــــــ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے ۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا ۔ میں نے سلاخ والی کھڑکی سے دیکھا اس کا رخ گراج کی طرف تھا ۔

میں غریب نواز سے گراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ دن کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ چیڑے کو سخت بخار تھا ۔ وہ اسے ٹانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بیہوش ہو گیا ــــ میں اور غریب نواز باہر دوڑے ۔ ٹانگے والے نے بیہوش چیڑے کو سنبھالا ہوا تھا ۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا ۔ میں نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا ۔ واقعی بہت تیز بخار تھا ۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہوگا ۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیئے ۔ اس نے دن کترے سے مشورہ کیا ۔ وہ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر چلا گیا ۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی ۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چیڑے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا ۔

"کیا ہوا میرے بیٹے کو ؟"

دن کترے نے جب اسے بتایا کہ چیڑہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور

غصے کے ساتھ کہا ـــــ "تم کیسے لوگ ہو ـــــ مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔" پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڑے کے پاؤں سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڑے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے، جیسے چڑے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڑے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڑے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے

میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، ون کترے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڑہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا "ممی! یو آر گریٹ۔"

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڑے کے تپے ہوئے

ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا "میرے بیٹے ـــــ میرے غریب بیٹے"

چڈے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا "نہیں ـــــ تمہارا بیٹا اول درجے کا سکاؤنڈرل ہے ـــــ جاؤ اپنے مرحوم خاوند کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو!"

ممی نے چڈے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا "فضول بکواس نہ کرو" پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا "لڑکو چڈہ بیمار ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے ـــــ سمجھے!"

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کون سی آفت آگئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا ـــــ ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ۔ مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اٹھوالیا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے سے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ

ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ روز کے بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا "عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔"

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا۔ "ایسی عورتیں عموماً خدمت گذار ہوا کرتی ہیں۔"

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے، جن کا جواب نہ آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لونا ولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا جس روز وہ پونے پہنچا اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا کہ جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا، اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بے کار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایل بہادران یعنی عقیل اور سکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے۔ کیوں کہ انہیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لئے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گذار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لونا ولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا

کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سین کے کمرے میں چونکہ جگہ خالی تھی، اس لئے اس نے وہیں اپنا ڈیرہ جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کی نئی فلم میں، ہیرو منتخب کرلیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائرکٹ کرنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یک مشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا: "میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ ـــــ ہیرو اور ڈائرکٹر بننے سے میرا تو خیال ہے یہی بہتر ہے۔"

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا۔ اس لئے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفع الحال تھا۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیصیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خرد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونے میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا کیوں کہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا مسٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا۔ کچھ پروانہ کرو اس لے کی ـــــ جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے۔ بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بیس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔

ہریش ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب و لہجے میں یاد کرا چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل در پیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسب معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما، تھیلما وغیرہ۔

سب آتی تھیں ۔ ون کترے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈیو ناچ کی تا تھئی اور دھانی ناکت کی ون ٹو تھری بنا بنا کر بتاتا تھا۔ اور وہ اسے سیکھنے کی پرخلوص کوشش کرتی تھی ۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا اور رنجیت کمار جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لئے جاتا تھا — چڈے کے ننگے ملک سن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے — ایک صرف وہ نہیں تھی — وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لئے صحیح تشبیہہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں ۔ پھر بھی کبھی کبھی جب چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا " چڈہ ۔ یو آر اے ڈیمڈ بروٹ ۔"

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرا دیتی تھی جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے " ڈونٹ ٹاک راٹ ۔"

ون کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی ۔ سرور میں آکر جب بھی وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا ہے تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا ہے ۔ وہ غریب چپ ہوجاتا اور اپنا میٹری کولیشن سرٹیفکٹ تہہ کرکے جیب میں ڈال لیتا ہے ۔

ممی ، وہی ممی تھی — پولی کی ممی ، ڈولی کی ممی ، چڈے کی ممی ، رنجیت کمار کی ممی۔ سوڈے کی بوتلوں ، گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے ساز و سامان کے انتظام میں وہ اسی پُرشفقت انہماک سے حصہ لیتی تھی ۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی واہیات ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے ۔ غمازے اور

سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ بلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈر کر سمٹ کر وہ دور ڑ گئے تھے ـــــ چیڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا ـــــ ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھیں۔

ون کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو می ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو می نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے قطع کرنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کٹی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپیہ کا انعام ملا تھا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دے دے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے کٹی سے کہا تھا: "تم اس وقت اسے دے دو ـــــ بعد میں لیتی رہنا"۔ اور مجھ سے اس نے پندرہ روز قیام کے دوران کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنے برس ہو گئے ہیں دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔ رنجیت کمار سے رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائرکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چیڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تو وہ اس سے کہتی تھی: "ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو"۔ چیڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی کہ "مجھے یہ آدمی ایرا غیرا سا معلوم ہوتا ہے ـــــ فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں" ـــــ یہ سن کر چیڈہ ہنس دیتا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی لئے میں واپس بمبئے چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی، بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاطہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کڈھب، بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگر کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح، باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم ہے۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائرکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونے ٹیلی فون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتے کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثہ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے۔ خون میں لت پت۔ چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش وحواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آگئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہوگئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا "بھایا جی ـــــ مر گیا؟"

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا۔ "مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں بھاگوں گا نہیں۔"

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا۔ اور تھوڑی

دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی، ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا۔ "بیٹا! گھبراؤ نہیں جو کچھ ہوا ہے سچ سچ بتا دو" ـــــ اور اس نے تمام واقعات من وعن بیان کر دیئے تھے کہ سین نے اس کو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا اور سین بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آکر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں۔ جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی فتح ہمیشہ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے۔ مگر ایک بڑی نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کئے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا "اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے ـــــ اور اس کا سہرا میری بڈھی ممی کے سر ہے"۔

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل برادرز شکیل

اور عقیل دونوں سعیدہ کاٹیج میں واپس آگئے تھے۔ باہر کی فضا کبھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لئے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمائے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انھوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لئے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انھوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا "اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمھاری ذاتی فلم کمپنی کھڑی کر دے۔"

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر خلاف معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کٹی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیئے اور رنجیت کمار سے اس نے کہا تھا۔ "تم ان بیچاری لڑکیوں کو یوں ہی جھانسے نہ دیا کرو ـــــ ہو سکتا ہے کہ تمھاری نیت صاف ہو مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی ـــــ کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!"

ممی نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو یہ مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لئے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے دن غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا ـــــ شیریں نے سفر کے لئے اس کو کھانا پکا کر دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے۔ ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے پونے جانا پڑا۔ سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزارہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنی خلا خود ہی پر کر دیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا شیریں بنی بیٹھ رہی تھی۔ شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو

کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لئے کہیں سے دو پیدا کئے تھے۔ ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لئے لے آیا تھا۔ چڈے نے آخری دولڈو اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا "تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے ـــــ بڑا کمال کیا ہے تو نے ـــــ اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کو دیکھنا، ہرگز کوئی بات نہ کرنا۔"

ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا "سالے میں اب کوئی بچے لاہوں ـــــ وہ تو دارو ہوتی ہے ـــــ ویسے بائی گوڈ ـــــ میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے۔"

چڈے نے اس قدر بے تحاشہ قہقہہ لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ، غریب نواز، اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہوگئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعہ سے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لئے لکھ رہا تھا۔ پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولود مسعود ہے اس لئے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر کھچی کھچی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ ہے۔ جب آدمی خود تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قتل کی ٹریجڈی ـــــ معلوم نہیں کیا وجہ تھی ـــــ لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے۔ بولتے تھے مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ میسرز فیت

پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ دن کترے بھی کہیں غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا تھا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا "اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے؟"

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی ـــــ ہاں دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے۔"

"کہاں ہے یہ ہزار؟" یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا

"میری جیب میں۔"

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا۔

"آج شام کرمی کے ہاں پہنچ جانا ـــــ ایک پارٹی ہے!"

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت ہی کرنے والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا ـــــ میں نے اس کے متعلق کچھ سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا۔ کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گراج کے

باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے اور نل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو ٹیفل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ، رنجیت کمار، کٹی اور ایلما کے ساتھ اور ون کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کود رہا تھا —— سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور بدیشی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی —— ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا "کس می ڈیر!"

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ اک دم پکارا "بند کرو —— اب شراب کا دور چلے گا" پھر اس نے نوکر کو آواز دی "اسکاٹ لینڈ کے شہزادے —— وسکی کی نئی بوتل لاؤ" اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا "ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی —— جانے دو، یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں"

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط تقریر شروع کی "لیڈیز اینڈ جنٹل مین —— آپ سب جہنم میں جائیں —— منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات

کی ـــــ وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے ـــــ مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے ـــــ کنویں میں اترنے والے ـــــ کنویں میں اترنے والے"۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا" افسوس کہ یہاں کوئی ہندستوڑ نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے۔ اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی تو کہے گا، پرسوں آپ سے ملا تھا ـــــ لعنت ہو اس کے نظام حیدر آباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے، کروڑہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں ـــــ ہاں ـــــ وہ کنویں میں اترنے والے ـــــ میں نے کیا کہا تھا کہ سب بکواس ہے ـــــ پنجابی میں جنھیں ٹوبے کہتے ہیں ـــــ وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں ـــــ اس لئے میں کہتا ہوں"۔

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا" یہ سب سازش ہے ـــــ اس منٹو کی سازش ہے ـــــ ورنہ میں نے ہر ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا ـــــ تم سب مردہ باد ـــــ لیکن پہلے میں ـــــ میں ـــــ" وہ جذباتی ہوگیا۔

"میں ـــــ جس نے اس رات اس ـــــ سانپ کے پیٹ کھیروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لئے اپنی ممی کو ناراض کر دیا ـــــ میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوآن سمجھتا تھا ـــــ لیکن نہیں ـــــ اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی قسم۔ ایک ہی بوسے میں اس پلیٹینم بلونڈ کے کنوارپنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا ـــــ لیکن یہ ایک ـــــ یہ ایک نامناسب حرکت تھی۔ ـــــ وہ کم عمر تھی ـــــ اتنی کم عمر، اتنی کمزور، اتنی کیریکٹرلس ـــــ اتنی ـــــ" اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا" بتاؤ یار اسے اردو، فارسی یا عربی میں کہیں گے۔ کیریکٹرلس ـــــ ایڈیز اینڈ جنٹلمن ـــــ وہ اتنی چھوٹی، اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی یا اسے قطعاً بھول جاتی ـــــ ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا ـــــ مجھے

اس کا دکھ ہوتا ہے ـــــ اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا ـــــ میں اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا ـــــ میں ایک پیگ اور پیتا ہوں۔"

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں ـــــ بولنے کے بعد جیسے چڈہ خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا، جیسے کوئی چیز کھونے کے لئے ایسا کونا ڈھونڈ رہا تھا جو اس کے ذہن میں محفوظ رہے۔ میں نے اس سے ایک بار پوچھا۔

"کیا بات ہے چڈے؟"

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ "کچھ نہیں ـــــ بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جملے کی لات نہیں مار رہی۔"

اس کا قہقہہ کھوکھلا رہا تھا۔

ون کترے نے تھیلما کو اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائرکٹر سیمن کی بات نکلی تو اس نے کہا "مسٹر منٹو ـــــ وہ ایک دم ہلکٹ آدمی تھا ـــــ کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں ـــــ جھوٹ بالکل جھوٹ ـــــ وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا۔"

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جٹرنگ بند کیا۔ کٹی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر ون کترے کے کدو ایسے سر پر دھپا مار کر کہا "بکواس بند کرے ـــــ الھڈ

اور کچھ گا ـــــ لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا۔"

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہ تھی۔ مُرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گاتا تھا پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے جن سے فضا بہت اداس ہوگئی۔ ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے ـــــ غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا "حیدرآباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ـــــ موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے۔"

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور ایلمک کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توے پر ریکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی۔ گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اٹھا لیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ ان میراثنوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔

اس اچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہوگئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا "بس، اب ختم!"

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا۔ اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا "چلو منٹو چلیں۔"

میں نے اٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا "آج کوئی الوداع نہیں کہے گا۔"

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈے سے کہا "ٹھہرو، کیا بات ہے۔" مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا۔ "اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے۔"

ممی کے گھر سے سعیدہ کا فلیٹ بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات

نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا "مجھے سخت نیند آ رہی ہے" اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ غریب نواز گراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس کے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "ممی چلی گئی"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں" یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔

چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا "چلی گئی ـــــ صبح کی گاڑی سے اسے پونا چھوڑنا تھا"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

چڈہ کے لہجے میں تلخی آ گئی "حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں ـــــ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی۔ اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں۔ اس لئے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی ـــــ وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلال کا کام لینا چاہتے تھے ـــــ ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت پولس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی۔ اس کو تڑی پار کر دیا ـــــ شہر بدر کر دیا ـــــ وہ اگر قحبہ تھی۔ دلالہ تھی ـــــ اس کا وجود سوسائٹی کے لئے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا ـــــ پونے کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو" چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے

دھو ڈالا ــــ لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہئے ــــ وہ پونے سے چلی گئی ہے۔ مجھے ایسے جوانوں میں ایسی جنس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا بنائے گی ــــ میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں ــــ زندہ باد ممی ــــ زندہ باد! ــــ چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہو گی ــــ ان حیدرآبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ــــ وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔"

میں نے دیکھا، چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں۔

# ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول۔ بہرحال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ باقی جو تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیے گئے۔

اُدھر کا معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا "مولبی ساب، یہ

پاکستان کیا ہوتا ہے؟" تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا "ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔"

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا "سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ـــــ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔"

دوسرا مسکرا دیا "مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ـــــ ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔"

ایک نہاتے نہاتے مسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے لیکن صحیح واقعات سے یہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرے دار سپاہی ان پڑھ جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے؟ اس کا محل وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ

ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مستقل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں ـــــ میں اسی درخت پر ہی رہوں گا۔"

بڑی مشکل کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس سی پاس ریڈیو انجینیر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفع دار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علٰحدہ علٰحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں مبتلا ہو کر پاگل ہوگیا تھا جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوگئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے ـــــ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ

کرے اس کو ہندوستان واپس بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورو پین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یورو پین وارڈ رہے گا یا اڑ جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنی پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان پر عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے "اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دمنگ دی دال آف دی لالٹین"۔ دن میں سوتا تھا نہ رات میں۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا "اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ"۔

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ وہ

بتانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے گا۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے گا۔ اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں گے۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کے بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم رہتا تھا اس لئے داڑھی اور بال آپس میں جم گئے تھے جن کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمین دار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے۔ مہینہ کون سا ہے۔ یا کتنے سال بیت ہو چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات کو آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑی گڑ گڑ دی اینکن دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھ میں آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کریدن بہ دن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی ہے۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں۔ پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس کے لئے پھل مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک دن بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں لگایا۔"

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ اسے حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا۔ "اوپڑی گڑگڑی انکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دا ہے گورو جی دا خالصہ ایندوا ہے گورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال ست اکال۔"

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے

لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا "یہ تم سے ملنے آیا ہے ـــــ تمھارا دوست فضل دین ہے"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ـــــ تمھارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ـــــ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ـــــ تمھاری بیٹی روپ کور...."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا ـــــ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔

"بیٹی روپ کور"

فضل دین نے رک رک کر کہا "ہاں .... وہ .... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ـــــ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ـــــ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے سلام کہنا ـــــ اور بہن امرت کور سے بھی .... بھائی بلبیر سنگھ سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے ـــــ وہ بھوری بھینس جو وہ چھوڑ گئے تھے ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ـــــ دوسرے کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی ..... اور ..... اور میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں..... اور یہ تمھارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

"ٹوبہ ٹیک سنگھ" اس نے قدرے حیرت سے کہا ـــــ "کہاں ہے؟ ـــــ وہیں ہے جہاں تھا"

بشن سنگھ نے پوچھا "پاکستان میں یا ہندوستان میں"

"ہندوستان میں ـــــ نہیں نہیں پاکستان میں" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا "اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی درفٹے مُنہ"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ کیوں کہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے ـــــ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں۔ بک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی ـــــ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا۔ اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ چند جو کچھ سوچ رہے تھے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا۔ کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا "پاکستان میں۔"

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے" ـــــ اور زور زور سے چلانے لگا۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا منگ دی دال آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہٹا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ـــــ اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا، اوندھے منہ لیٹا تھا۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ـــــ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

---

# سڑک کے کنارے

یہی دن تھے ـــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ دھلا ہوا، نکھرا ہوا۔ اور دھوپ بھی ایسی کنکنی تھی ـــــ سہانے خوابوں کی طرح۔ مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے ـــــ اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح سب کے حوالے کر دی تھی۔

اس نے مجھ سے کہا تھا ـــــ تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کئے ہیں یقین جانو، میری زندگی ان سے خالی تھی ـــــ جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پر کی ہیں۔ تمھاری شکر گذار ہیں۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ ادھوری رہتی ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم سے اور کیا کہوں .... میری تکمیل ہو گئی ہے۔ ایسے مکمل طور پر کہ محسوس ہوتا ہے، مجھے اب تمھاری ضرورت نہیں رہی ..... اور وہ چلا گیا۔ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔"

"میری آنکھیں روئیں میرا دل رویا.... میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے لاکھ مرتبہ پوچھا کہ میری ضرورت اب تمہیں کیوں نہیں رہی .... جب کہ تمھاری ضرورت ـــــ اپنی تمام شدتوں کے ساتھ اب شروع ہوئی ہے۔ ان لمحات کے بعد جنھوں نے بقول تمھارے تمھاری ہستی کی خالی جگہیں پُر کی ہیں۔"

اس نے کہا۔ "تمھارے وجود کے جس ذرے کو میری ہستی کی تعمیر و تکمیل کی ضرورت

تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے ـــــ اب جب کہ تکمیل ہوگئی ہے تمہارا اور میرا خود بخود کم ہو گیا ہے۔

کس قدر ظالمانہ لفظ تھے ـــــ مجھ سے یہ پتھراؤ برداشت نہ کیا گیا ـــــ میں چیخ کر رونے لگی ـــــ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا ـــــ میں نے اس سے کہا ـــــ "یہ ذہن جن سے تمہاری ہستی کی تکمیل ہوئی ہے، میرے وجود کا ایک حصہ تھے ـــــ کیا ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں ـــــ کیا میرے وجود کا بقایا حصہ ان سے اپنا ناطہ توڑ سکتا ہے؟ ـــــ تم ہو گئے ہو لیکن مجھے ادھورا کر کے ـــــ کیا میں نے اسی لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا؟"

اس نے کہا "بھونرے پھولوں اور کلیوں کا رس چوس چوس کر شہد کشید کرتے مگر وہ اس کی ٹھیٹ تک بھی ان پھولوں اور کلیوں کے ہونٹوں تک نہیں لاتے ـــــ خدا پرستش کرتا ہے مگر خود بندگی نہیں کرتا ـــــ عدم کے ساتھ خلوت میں چند لمحات بسر کر کے میں نے وجود کی تکمیل کی ـــــ لیکن اب عدم کہاں ـــــ اس کی اب وجود کو کیا ضرورت ہے وہ ایک ایسی ماں تھی جو وجود کو جنم دیتے ہی زچگی کے بستر پر فنا ہو گئی تھی۔"

عورت روسکتی ہے ـــــ دلیلیں پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل اس کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے ـــــ میں نے اس سے کہا "دیکھو ـــــ میں رو رہی ہوں ـــــ میری آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں۔ تم جا رہے ہو تو جاؤ، مگر ان میں سے کچھ آنسو کو تو اپنے رومال کے کفن میں لپیٹ کر ساتھ لیتے جاؤ ـــــ میں تو ساری عمر روتی رہوں گی ـــــ مجھے اتنا تو یاد رہے گا کہ چند آنسوؤں کے کفن دفن کا سامان تم نے بھی کیا تھا ـــــ مجھے خوش کرنے کے لئے!"

اس نے کہا "میں تمہیں خوش کر چکا ـــــ کیا اس کا لطف، اس کا کیف تمہارے زندگی کے بقایا لمحات کا سہارا نہیں بن سکتا۔ تم کہتی ہو کہ میری تکمیل نے تمہیں ادھورا کر دیا ہے ـــــ لیکن یہ ادھورا پن ہی کیا جو تمہاری زندگی کو متحرک کرنے کے لئے کافی نہیں ـــــ میں

مردہو۔ ــــ آج تم نے میری تکمیل کی ہے ــــ کل کوئی اور کرے گا ــــ میرا وجود کچھ ایسے آب و گل سے بنا ہے جس کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آئیں گے جب وہ خود کو تشنۂ تکمیل سمجھے گا ــــ اور تم ایسی کئی عورتیں آئیں گی جو ان لمحات کی پیدا کی ہوئی خالی جگہوں کو پُر کریں گی۔"

میں روتی رہی جھنجھلاتی رہی۔

میں نے سوچا ــــ یہ چند لمحات جو ابھی ابھی میری مٹھی میں تھے ــــ نہیں ــــ میں ان لمحات کی مٹھی میں تھی ــــ میں نے کیوں خود کو ان کے حوالے کر دیا ــــ میں نے کیوں اپنی پھڑپھڑاتی روح ان کے منہ کھولے قفس میں ڈال دی ــــ اس میں مزا تھا، ایک لطف تھا ــــ ایک کیف تھا ــــ تھا، ضرور تھا ــــ اور یہ اس کے اور میرے تصادم میں تھا ــــ لیکن یہ کیا، کہ وہ ثابت و سالم رہا ــــ اور مجھ میں تریڑے پڑ گئے ــــ یہ کیا، کہ وہ اب میری ضرورت کو محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں اور بھی شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں ــــ وہ طاقت ور بن گیا ہے۔ میں نحیف ہوگئی ہوں ــــ یہ کیا کہ آسمان پر دو بادل ہم آغوش ہوں۔ ایک رو رو کر برسنے لگے، دوسرا بجلی کا کوندا بن کر اس بارش سے کھیلتا کوکڑے لگاتا بھاگ جائے ــــ یہ کس کا قانون ہے؟ آسمانوں کا؟ زمینوں کا؟ ــــ یا ان کے بنانے والے کا؟

میں سوچتی رہی اور جھنجھلاتی رہی۔

دو روحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا، اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا ــــ کیا یہ سب شاعری ہے؟ ــــ نہیں، دو روحیں سمٹ کر ضرور اس ننھے سے نکتے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے ــــ لیکن اس کائنات میں ایک روح کیوں کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے ــــ کیا اس قصور پہ کہ اس نے دوسری روح کو اس ننھے سے نکتے پر پہنچنے میں مدد دی تھی۔

یہ کیسی کائنات ہے۔

یہی دن تھے ـــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی ـــــ اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی بھڑبھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی ـــــ وہ موجود نہیں ہے ـــــ بجلی کا کوندا بن کر جانے وہ کن بدلیوں کی گریہ وزاری سے کھیل رہا ہے ـــــ اپنی تکمیل کر کے چلا گیا تھا ـــــ ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا ـــــ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے ـــــ کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے ؟"

نہیں نہیں ـــــ یہ کیسے تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ تو تخریب ہے ـــــ

لیکن یہ میرے جسم کی خالی گہنیں کیوں پر ہو رہی ہیں ـــــ یہ جو گڑھے تھے، کس ملبے سے پر کئے جا رہے ہیں ـــــ میری رگوں میں یہ کیسی سرسراہٹیں دوڑ رہی ہیں۔ میں سمٹ کر اپنے پیٹ میں کس ننھے سے نکتے پر پہنچنے کے لئے پیچ و تاب کھا رہی ہوں۔ میری ناؤ ڈوب کر اب کن سمندروں میں ابھرنے کے لئے اٹھ رہی ہے ـــــ ؟

یہ میرے اندر دہکتے ہوئے چولھوں پر کس مہمان کے لئے دودھ گرم کیا جا رہا ہے ـــــ یہ میرا دل میرے خون کو دھنک دھنک کر کس لئے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے خیالات کے رنگ برنگ دھاگوں سے کس کے لئے ننھی منی پوشاکیں تیار کر رہا ہے ـــــ ؟

میرا رنگ کس لئے نکھر رہا ہے ـــــ میرے انگ انگ اور روم روم میں کھنسی ہوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں ؟

یہی دن تھے ـــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے ـــــ لیکن یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اتر کر میرے پیٹ میں تن گیا ہے ـــــ اس کی نیلی نیلی آنکھیں کیوں میری رگوں میں دوڑتی پھرتی ہیں ؟

میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کی محرابوں ایسی تقدیس کیوں آ رہی ہے؟
نہیں، نہیں ـــــ یہ تقدیس کچھ بھی نہیں ـــــ میں ان محرابوں کو ڈھا دوں گی۔
ـــــ میں اپنے اندر وہ تمام چور لمحے سرد کر دوں گی جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھی ہیں۔ میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھاگے آپس میں الجھا دوں گی۔
یہی دن تھے ـــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے لیکن میں وہ دن کیوں یاد کرتی ہوں، جن کے سینے پر سے وہ اپنے نقش قدم بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔
لیکن یہ ـــــ یہ نقش قدم کس کا ہے ـــــ جو میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے۔ کیا یہ میرا جانا پہچانا نہیں ـــــ میں اسے کھرچ دوں گی ـــــ اسے مٹا دوں گی۔ یہ سولی ہے۔ پھوڑا ہے۔ بہت خوفناک پھوڑا۔
لیکن مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھاہا ہے ـــــ پھاہا ہے تو کس زخم کا؟
اس زخم کا جو مجھے لگا کر چلا گیا تھا؟ ـــــ نہیں، نہیں ـــــ یہ تو ایسا لگتا ہے کسی پیدائشی زخم کے لئے ہے ـــــ ایسے زخم کے لئے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا ـــــ جو میری کوکھ میں جانے کب سے سو رہا تھا۔
یہ کوکھ کیا ـــــ؟ ـــــ فضول سی مٹی کی ہنڈ کلھیا ـــــ بچوں کا کھلونا ـــــ میں اسے توڑ پھوڑ دوں گی۔
لیکن یہ کرن میرے کان میں کہتا ہے "یہ دنیا ایک چوراہا ہے ـــــ اپنا بھانڈا کیوں اس میں پھوڑتی ہے ـــــ یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اٹھیں گی"
انگلیاں ـــــ ادھر کیوں نہ اٹھیں گی جدھر وہ اپنی ہستی مکمل کر کے چلا گیا تھا ـــــ کیا ان انگلیوں کو وہ راستہ معلوم نہیں ـــــ یہ دنیا ایک چوراہا ہے ـــــ لیکن اس وقت تو وہ مجھے ایک دوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اِدھر بھی ادھورا پن تھا۔ اُدھر بھی ادھورا پن۔

ادھر بھی آنسو، اُدھر بھی آنسو ۔

لیکن یہ کس کا آنسو میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے ــــ یہ کہاں بندھے گا؟ انگلیاں اٹھیں گی ۔ جب سیپ کا منہ کھلے گا اور موتی پھسل کر باہر جو پڑا ہے میں گر پڑے گا تو انگلیاں اٹھیں گی ــــ سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی ــــ اور یہ انگلیاں سنپولیاں بن بن کر ایک دوسرے کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی ۔

آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے ــــ یہ گر کیوں نہیں پڑتا ــــ وہ کون سے ستون ہیں جو اس کو تھامے ہوئے ہیں ــــ کیا اس دن جو زلزلہ آیا تھا وہ ان ستونوں کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے کافی تھا ــــ یہ کیوں اب تک میرے سر کے اوپر اسی طرح تنا ہوا ہے؟

میری روح پسینے میں غرق ہے ــــ اس کا ہر مسام کھلا ہوا ہے ۔ چاروں طرف آگ دہک رہی ہے ــــ میرے اندر کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہے ــــ دھونکنیاں چل رہی ہیں ۔ شعلے بھڑک رہے ہیں ۔ سونا آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ابل رہا ہے ۔ میری رگوں میں نیلی آنکھیں دوڑ دوڑ کر ہانپ رہی ہیں ــــ گھنٹیاں بج رہی ہیں ــــ کوئی آرہا ہے ــــ کوئی آرہا ہے ــــ

بند کر دو ۔ بند کر دو کواڑ ۔

کٹھالی الٹ گئی ــــ پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہے ــــ گھنٹیاں بج رہی ہیں ــــ وہ آرہا ہے ــــ میری آنکھیں مند رہی ہیں ــــ نیلا آسمان گدلا ہو کر نیچے آرہا ہے ۔

یہ کس کے رونے کی آواز ہے ــــ اسے چپ کراؤ ــــ اس کی چیخیں میرے دل پر ہتھوڑے مار رہی ہیں ۔ چپ کراؤ ۔ اسے چپ کراؤ ــــ میں گود بن رہی ہوں ۔ میں کیوں گود بن رہی ہوں ۔

میری باہیں کھل رہی ہیں ۔ چوٹھوں پر دودھ ابل رہا ہے ۔ میرے سینے کی گولائیاں

یاں بن رہی ہیں ـــ لاؤ۔ اس گوشت کے لوتھڑے کو میرے دھڑکتے ہوئے خون کے
نرم گالوں میں لٹا دو ـــ

مت چھینو ـــ مت چھینو اسے ـــ مجھ سے جدا نہ کرو۔ خدا کے لئے مجھے
نہ کرو۔

انگلیاں ـــ انگلیاں ـــ اٹھنے دو انگلیاں ـــ مجھے کوئی پروا نہیں ـــ یہ
یا جو رہا ہے ـــ پھوٹنے دو میری زندگی کے تمام بھانڈے ـــ میری زندگی تباہ ہو جائے
ہ ـــ ہو جانے دو ـــ مجھے میرا گوشت واپس دے دو ـــ میری روح کا یہ ٹکڑا
دے مت چھینو ـــ تم نہیں جانتے یہ کتنا قیمتی ہے ـــ یہ گوہر ہے جو مجھے ان چند
ات نے عطا کیا ہے ـــ ان چند لمحات نے جنھوں نے میرے وجود کے کئی ذرّے چن
ن کر کسی کی تکمیل کی تھی اور مجھے اپنے خیال میں ادھوری چھوڑ کے چلے گئے تھے ـــ میری
یل آج ہوئی ہے۔

مان لو ـــ مان لو ـــ میرے پیٹ کے خلا سے پوچھو ـــ میری دودھ سے
بھری ہوئی چھاتیوں سے پوچھو ـــ ان لوریوں سے پوچھو، یہ میرے انگ انگ اور روم
روم میں تمام ہچکیاں سلا کے آگے بڑھ رہی ہیں ـــ ان جھولنوں سے پوچھو جو میرے بازوؤں
ں ڈالے جا رہے ہیں۔

انگلیاں ـــ اٹھنے دو انگلیاں ـــ میں انھیں کاٹ ڈالوں گی ـــ شور مچے گا
بس یہ انگلیاں اٹھا کر اپنے کانوں میں ٹھونس لوں گی۔ میں گونگی ہو جاؤں گی۔ بہری ہو جاؤں
ی۔ اندھی ہو جاؤں گی ـــ میرا گوشت میرے اشارے سمجھ لیا کرے گا ـــ میں اسے ٹٹول
ٹٹول کر پہچان لیا کروں گی۔

مت چھینو ـــ مت چھینو اسے ـــ یہ میری کوکھ کی مانگ کا سیندور ہے۔ یہ میری
ممتا کے ماتھے کی بندیا ہے ـــ میرے گناہ کا کڑوا پھل ہے ـــ لوگ اس پر تھو تھو

کریں گے ؟ ـــــ میں چاٹ لوں گی یہ سب تھوکیں ـــــ
دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں ـــــ تمھارے پاؤں پڑتی ہوں ۔
میرے بھرے ہوئے دودھ کے برتن اوندھے نہ کرو ـــــ میرے دل کے دھکتے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں آگ نہ لگاؤ ـــــ میری بانہوں کے جھولنوں کی رسیاں نہ توڑو ـــــ میرے کانوں کو ان گیتوں سے محروم نہ کرو جو اس کے رونے میں مجھے سنائی دیتے ہیں ۔
مت چھینو ـــــ مت چھینو ـــــ مجھ سے جدا نہ کرو ـــــ خدا کے لئے مجھے اس سے جدا نہ کرو ۔

لاہور ۲۱ جنوری

دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا کسی سنگ دل نے بچی کی گردن کو مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مرجائے مگر وہ زندہ تھی ۔ بچی بہت خوبصورت ہے ۔ آنکھیں نیلی ہیں ۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے ۔

# جانکی

پونا میں رسیوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا۔ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔ اسے یا تو پونا میں یا بمبے کی کسی فلم کمپنی میں ملازم کرا دو۔ تمھاری واقفیت کافی ہے۔ امید ہے تمھیں زیادہ دقت نہ ہوگی۔

دقت کا تو زیادہ سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنھیں ان کی کمائی کھانا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا لیکن پھر میں نے سوچا۔ عزیز اتنا پرانا دوست ہے۔ جانے کس یقین کے ساتھ اس نے جانکی کو میرے پاس بھیجا ہے۔ اس کو مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لئے اگر وہ حیوان ہو ہر فلم کے دروازے کھلے ہیں۔ تردد کی بات ہی کیا ہے۔ میری مدد کے بغیر بھی اسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔

خط ملنے کے چوتھے روز وہ پہنچ گئی۔ کتنا لمبا سفر طے کر کے آئی تھی۔ پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونا۔ پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا اس لئے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دور نہ چلنا پڑا۔ کیوں کہ سکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی، اتری۔ میری

طرف بیٹھ کر کے وہ کھڑی ہوگئی اور ایڑیاں اونچی کر کے ہجوم میں مجھے تلاش کرنے لگی۔ میں نے قریب جا کر کہا "جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہوں"

وہ پلٹی "اوہ آپ" ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلف انداز میں کہا "سعادت صاحب! سفر بہت ہی لمبا تھا۔ بمبے میں فرنٹیئر میل سے اتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹنا پڑا اس نے طبیعت صاف کر دی"

میں نے کہا "اسباب کہاں ہے آپ کا؟"

"لاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی اور سوٹ کیس اور ایک بستہ نکالا۔ میں نے قلی بلوایا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا "میں ہوٹل میں ٹھہروں گی"

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لئے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا۔ اسے غسل وسل کر کے کپڑے تبدیل کر کے آرام کرنا تھا۔ اس لئے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور یہ کہہ کر وہ صبح دس بجے مجھ سے ملے، ہوٹل سے چل دیا۔

صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر، جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھیرا ہوا تھا، آئی۔ جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہوگئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں جو نیا نیا بنا تھا، موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر میں جاگا تھا۔ اس لئے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا کہ وہ اچانک داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر، ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ اندار عورت تھی۔ مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا، داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔

جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھرپور تھی۔ لیکن جب

پربھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ سوائے ایک بیوقوف نوکر کے۔ میرے دوست کا گھر جس میں میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لئے ٹھہرا ہوا تھا، بالکل سنسان تھا۔ بجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی ہے۔

میں نے چار کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا "ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی۔ پھر بھی شوق فرمائیے۔"

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چار کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع کی۔ اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن جھجکتی ہے۔ میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر نے چھیڑا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟"

"جی؟ ــــ جی نہیں۔"

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا۔ چار ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی چاہئے۔ چنانچہ میں نے پوچھا "عزیز صاحب کیسے ہیں؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ چار کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا "منٹو صاحب! آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "یونا میں تو کسی کو نہیں جانتا۔"

"اوہ!"

میں نے پوچھا "کیوں، آپ کیا بیمار ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا "کیا تکلیف ہے؟"

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لئے جاتے تھے وا ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ سلگا کر کہا "معاف کیجئے گا۔ میں سگریٹ پیا کرتی ہوں"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔ بالکل مردوں کی طرح سگرٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی تھی اور ایک دن میں تقریباً بچھتہ سگرٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا "تم آپ کہتی کیوں نہیں کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟"

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا "ہائے اللہ۔ میں کیسے بتاؤں آپ کو" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ مڑے ہوئے تیکھے ہونٹوں کی گولائی میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔ وہ بیٹھ گئی اور سیری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا "بات یہ ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ.....!"

پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا۔ لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا۔

"اکثر ایسا ہوتا ہے"

اس نے زور سے کش لگایا اور مردوں کی طرح زور سے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے کہا "نہیں ــــ یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہر نہ گیا ہو"

میں نے کہا ــــ "اوہ"

اس نے سگرٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن جار کی طشتری میں دبائی "اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی گڑبڑ ہو گئی تھی لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دنوں میں سب صاف ہو گیا تھا!"

میں نے پوچھا "آپ کو بچے پسند نہیں ؟"

وہ مسکرائی "پسند ہیں ـــــ لیکن کون پالتا پھرے"

میں نے کہا "آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے"

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ پھر اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کون سی بات ہے یہ اپنی ہی تو چیز ہے اور قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضایع کراتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے ـــــ بڑا جرم ہے"

میں بے اختیار ہنس پڑا "عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی"

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کر دیا "عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں"

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پرخلوص ہوں ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آجاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں پوچھا "سعادت صاحب بتائیے کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں ؟"

میں نے کہا "بہت"

"جھوٹ"

"اس کا ثبوت ؟"

اس نے سگرٹ سلگانا شروع کر دیا "بھئی شاید ایسا ہو۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ بیوقوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں۔ زیادہ ہنستی ہوں ـــــ اب آپ ہی دیکھئے نا۔ زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے ہے جانکی کم کھایا کرو۔ پر میں نے انکی ایک نہ سنی ـــــ سعادت صاحب ! بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو سر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں"

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہوگیا۔
اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی۔ بیچ بیچ میں گھنگھرو سے بجتے تھے۔
وہ پھر اسقاط حمل کے متعلق باتیں شروع کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا آگیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا کیوں کہ اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائرکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کر رہا تھا اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لئے ضرور لے لے گا۔
پونا میں جتنے اسٹوڈیو تھے میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کے لئے کوشش کی۔ کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا، کسی نے کیمرہ ٹسٹ۔ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے سے پریشان تھی۔ چار یا پانچ دن متواتر جب اسے مختلف کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گذارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ بچہ ضائع کرنے کے لئے وہ ہر روز بیس گرین کونین کھاتی تھی اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی رہتی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گذرتے ہیں۔ اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی۔ پونا پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلا ناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔
عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی اس کا مجھے علم نہیں لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے اس لئے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں۔ گھر میں کئی بار بیوی کا ان سے جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انہوں نے کبھی چوں بھی نہیں کی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکرمند رہتی ہے محض بکواس ہے بناوٹ ہے، لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب بھی خط آیا جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔

فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط نکلا۔ دن واقعی اوپر ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بات جس کا اسے کھٹکا تھا نہیں تھی۔

جانکی کو پونا آئے بیس روز ہو چلے تھے۔ عزیز کو وہ خط پر خط لکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے۔ ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونا میں اگر جانکی کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبے میں کوشش کروں کیوں کہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں۔ بات معقول تھی لیکن میں سینیریو لکھنے میں مصروف تھا۔ اس لئے جانکی کے ساتھ میرا بمبے جانا بہت مشکل تھا لیکن میں نے پونا سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا، ٹیلی فون کیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہیں تھا۔ آفس میں نرائن کھڑا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ پونا سے میں بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلایا "ہلو منٹو ـــــ نرائن اسپیکنگ فرام دس اینڈ ـــــ کہو کیا بات ہے۔ سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے۔ گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا مطلب؟"

نرائن نے ادھر سے جواب دیا "کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں۔ رضیہ نے ایک اور آدمی سے آنکھ لڑا لیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے؟"

نرائن بولا "بڑا کمینہ ہے یار سعید ـــــ اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید

کر دیئے تھے۔ خیر چھوڑو اس کی بات کیا ہے ؟"

میں نے اس سے کہا " بات یہ ہے پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے "۔

جانکی میرے پاس کھڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب وموزوں لفظوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا۔ میں تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی " عورت ؟ ۔۔۔ پشاور کی عورت ۔۔۔ خو، بھیجو اس کو جلدی ۔۔۔ خو ہم بھی قصور کا پٹھان ہے "

میں نے کہا " بکواس نہ کرو نرائن سنو۔ کل دکن کوئن سے میں اسے بمبے بھیج رہا ہوں۔ سعید یا تم کوئی بھی اسے اسٹیشن لینے کے لئے آجانا ۔۔۔ کل دکن کوئن سے۔ یاد رہے "

نرائن کی آواز آئی " پر ہم اسے پہچانیں گے کیسے ؟"

میں نے جواب دیا " وہ خود تمھیں پہچان لے گی۔ لیکن دیکھو کوشش کرکے اسے کہیں نہ کہیں ضرور رکھوا دینا " تین منٹ گذر گئے۔ میں نے ٹیلی فون بند کیا اور جانکی سے کہا " کل دکن کوئن سے تم بمبے چلی جانا۔ سعید اور نراین کی تصویریں تمھیں دکھا دیتا ہوں۔ لمبے تڑنگے خوبصورت جوان ہیں۔ تمھیں پہچاننے میں دقت نہ ہو گی "

میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نراین کے مختلف فوٹو دکھائے۔ دیر تک وہ انھیں دیکھتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔

البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا " دونوں کیسے آدمی ہیں ؟"

" کیا مطلب ؟"

" مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں ۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی برے ہوتے ہیں " اس کے لہجے میں ایک ٹوہ لینے والی سنجیدگی تھی۔

میں نے کہا: "یہ تو درست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت کہاں ہوتی ہے؟"

"کیوں؟"

"دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی جان کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں؟"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: "وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا: "بالکل درست۔ فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل سے واقفیت ہو۔ ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے۔ یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ وہ عورت جو پانچ وقت چار نماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سور کے برابر سمجھتی ہے وہ کیمرے کے سامنے آکر مرد کے ساتھ اظہار محبت کیا خاک کرے گی۔"

اس نے پھر کچھ دیر سوچا: "اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔"

میں نے کہا: "یہ ضروری نہیں۔ فلم لائن میں آکر بھی وہ یہ سب جان سکتی ہے۔"

اس نے میری بات پر غور نہ کیا اور جو پہلا سوال کیا تھا پھر اسے دہرایا: "سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں؟"

"تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟"

"تفصیل سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ کہ دونوں میں سے تمہارے لئے کون بہتر رہے گا؟"

جانکی کو میری یہ بات ناگوار گذری: "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟"

"جیسی تم چاہتی ہو۔"

"بتلایئے بھی۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ "میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔"
میں نے مسکرا کر کہا۔ "جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کردوں گا۔"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔"
میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ سعید شاعر ہے۔ ایک بڑی بے رحم قسم کا شاعر۔ مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کے بجائے اس کی گردن مروڑے گا۔ گردن مروڑ کر پر نوچے گا۔ پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالے گا۔ یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اس مرغی کی موت پر ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوگی۔
شراب پئے گا تو کبھی بہکے گا نہیں۔ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیوں کہ شراب کا مطلب ہی فوت ہوجاتا ہے۔ صبح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اٹھے گا۔ نوکر چائے کی پیالی بنا کر دے گا۔ اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیلے گا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پئے گا جیسے اس میں ذائقے کی کوئی مہک ہی نہیں۔
بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے۔ مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ پیپ نکل رہی ہے۔ گل سڑ گیا ہے۔ ناسور بننے کا خطرہ ہے لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ آپ اس سے کہیں گے تو جواب ملے گا۔ "اکثر اوقات بیماریاں انسان کا جزو بدن ہوجاتی ہیں۔ جب مجھے یہ زخم کوئی تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی بڑا اچھا شعر نظر آ گیا ہے۔
ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا اس لئے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب قریب عاری ہے۔ میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث

مقبول ہوا تھا۔ ایک سین میں اسے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اظہار
ن کرنا تھا۔ خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے
کا بچہ پکڑا جاتا ہے۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ایکٹر بننے کا خیال دل سے نکال
اچھے شاعر ہو۔ گھر میں بیٹھو اور نظمیں لکھو۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی ایکٹنگ کی دھن
رہے۔

نرائن مجھے بہت پسند ہے۔ اسٹوڈیو کی طرح کے اصول جو اس نے اپنے لئے وضع
کئے ہیں۔ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

۱۔ ایکٹر جب تک ایکٹر ہے اسے شادی نہیں کرنی چاہئے۔ شادی کرے تو فوراً فلم کو
ق دے کر دہی کی دکان کھول لے۔ اگر شوہر ایکٹر ہے تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔

۲۔ کوئی ایکٹریس تمہیں بھیا یا بھائی صاحب کہے تو تم فوراً اس کے کان میں کہو: "آپ
انگیا کا سائز کیا ہے؟"

۳۔ کسی ایکٹریس پر اگر تمہاری طبیعت آگئی تو تمہیدیں باندھنے پر وقت ضائع نہ
و۔ اس سے تخلیے میں ملو اور کہو: "میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔" اسے یقین نہ آئے تو
ی جیب باہر نکال کر دکھا دو۔

۴۔ اگر کوئی ایکٹریس تمہارے تھیلے میں آجائے تو اس کی آمدن میں سے ایک پیسہ
بھی نہ لو۔ ایکٹرسوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لئے یہ پیسہ حلال ہے۔

۵۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹریس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ سوراج
نے کے بعد! البتہ تم اس قسم کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

۶۔ یاد رکھو ایکٹریس کی مانگ بھی ہوتی ہے۔ اسے ریزر اور کنگھی سے سنوارنے کی
بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کرو۔ مثال کے طور پر کوئی نیک
نام کر کے۔

۷۔ اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو۔ صبح اسٹوڈیو میں وقت سلام کرنے سے تمھیں فائدہ ہوگا۔ یہاں نہیں تو دوسری دنیا میں جہاں فلم کمپنیاں ہوں گی۔

۸۔ شراب اور ایکٹرس کی عادت ہرگز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کسی روز کانگریس لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دے۔

۹۔ سوداگر، ہندو سوداگر ہو سکتا ہے مسلمان سوداگر ہو سکتا ہے لیکن ایکٹر ایکٹر یا مسلم ایکٹر کبھی نہیں ہو سکتا۔

۱۰۔ جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں "نراین کے دس احکام" کے عنوان تلے اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں۔ جن سے اس کے کیریکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ سب پر عمل نہیں کرتا۔ ممکن ہے سچ ہو۔ لیکن ان میں سے وہ اکثر پر عمل کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

سعید اور نراین کے بارے میں جو میرے خیالات تھے میں نے جانکی کے پوچھے اشارتاً بتا دیئے۔ اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا: "اگر تم فلم لائن میں آگئی تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمھیں لینا ہی پڑے گا۔ نراین کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہوگا۔"

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور پھر چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیوں کہ نراین نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک سال کے لئے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرا دیا تھا۔ یہ ملازمت اسے کیسے ملی؟ دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جب اور سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا: "سعید اور نراین دونوں سے تمھاری ملاقات ہوئی، ان میں سے کس کو تم نے زیادہ پسند کیا؟"

جانکی کے ہونٹوں پر تیکھی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ،اس نے کہا: "سعید صاحب کو!" یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی: "سعادت صاحب ،کیوں اتنے پل باندھے تھے نراین کی تعریفوں کے؟"

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

"بڑا ہی واہیات آدمی ہے ___ شام کو باہر کرسیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ پینے کے لئے بیٹھے تو باتوں باتوں میں اس نے نراین کو کھبیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان ں لا کر نراین نے پوچھا ___ تمھاری انگیا کا سائز کیا ہے؟ بھگوان جانتا ہے میرے ن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ کیسا لچر آدمی ہے۔" جانکی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے تیزی سے کہا: "آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟"

"اس کی بیوقوفی پر۔" یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کر دیا۔

تھوڑی دیر نراین کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکرمند لہجے میں شروع کر دیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اسے ستا تھے۔ کہیں انھیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھا دھند سائیکل چلاتے ہیں، کہیں حادثہ ہو گیا ہو۔ پونا ہی نہ آ رہے ہوں۔ کیوں کہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انھوں نے کہا ایک روز میں چپ چاپ تمھارے پاس چلا آؤں گا۔ باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تردد تو اس نے عزیز کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں ز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل ڑ ہے۔ اس لئے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انھیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک جانکی کو ٹائیفائڈ ہو گیا تو بیس دن متواتر نرسوں کی طرح اس کی تیمارداری کرتے رہتے ۔ وغیرہ وغیرہ۔

مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی۔ ج
اس کے لئے ایک نئی اور رنگیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔

پونا میں مجھے تقریباً دو مہینے اس کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخد
وصول کرنے میں نے بمبئی کا رخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کانٹریکٹ مل رہا تھا۔

میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور ن
دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سور
ہوں گے تکلیف نہیں دینی چاہئے۔ پچھلی طرف دروازہ ہے جو نوکر کے لئے اکثر کھلا رہتا
میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر سعید اور اس کے ر
کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا۔
پر کمبل پڑا تھا جو میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سعید کے
سے ایک چوڑیوں والا بازو نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔
کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ——— سعید کے ساتھ جانکی لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے کرسی پر
شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔

نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے۔ اس کی شوٹنگ
ہوئی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا۔ لیکن وہ مجھ سے باتیں
چاہتا تھا کسی خاص موضوع پر نہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بیہودہ بکو
کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ صبح نو بجے تک ہم بیہودہ بکواس میں مشغول رہے جس میں بار بار
کا ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا۔ ہنستے ہنستے اس نے

سب سے مزیدار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا کہ تمہاری جان کا کیا حال ہے تو اس نے بتایا۔ کہا نچو بیس نے ——— اس کے بعد اچانک اسے میرے بدن [illegible] کا احساس ہوا اور مجھے کوسنے لگی۔ بالکل بچی ہے۔ اب جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو سینہ پر [illegible] ہاتھ رکھ لیتی ہے لیکن منٹو! بڑی وفادار عورت ہے۔"

میں نے کہا "یہ تم نے کیسے جانا؟"

نرائن مسکرایا۔ "وہ عورت جو ایک اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا ساز بتا دے اور پھر وہ عورت کے بارے ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

عجیب و غریب منطق تھی۔ لیکن نرائن نے بڑی سنجیدگی سے تعریف کی اور کہا کہ جانکی بڑی پرخلوص عورت ہے۔ اس نے کہا "منٹو تمہیں معلوم نہیں سعید کی یہ جتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پڑے پڑے سب کا بے پروا ہو آسان کام نہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کام کو بڑی آسانی سے کر رہی ہے۔ خدمت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایماندار اور پرخلوص آیا بھی ہے۔ نتیجہ اندر کہ وہ اس خدمات کو جتلانے میں ادنیٰ لطف محسوس کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے۔ کپڑے پہناتی ہے۔ ناشتہ کراتی ہے اور رات کو جب وہ بہت پی کر بستر پر لیٹتا ہے تو سب دروازے بند کرکے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے اور جب اتفاق سے کہیں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید صاحب کی باتیں کرتی ہے ——— سعید صاحب [illegible] اور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لئے پشاور سے سینڈل منگوائی۔ سعید صاحب کے سر میں آج ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپرو لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر [illegible] اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انگیا والی بات یاد کرکے تیوری چڑھا لیتی ہے۔"

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے متعلق خود سے کوئی بات نہ کی۔ شاید اس لئے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا تھا۔ جانکی

سے البتہ کافی باتیں ہوئیں ۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی لیکن اسے اس کی بے پرواطبیعت کا بہت گلا تھا: "سعادت صاحب اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے ۔ بہت بے پروا ہیں ۔ ہر وقت سوچتا جو ہوا ۔ اس لئے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا ۔ آپ ہنسیں گے ۔ لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں"

نراین نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک نکلا ۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی ۔ میں دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا ۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا ۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کا کیا ہوا ۔ جانکی کو اس کا بھی بہت خیال رہتا تھا ۔ کیا سعید کو پاکر وہ اسے بھول چکی تھی ۔ میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا ۔ جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا، اس کے مالک سے میری کسی بات پر رنجش ہوگی ۔ اور میں دماغی تکدر دور کرنے کے لئے پونا چلا گیا ۔ دو ہی دن گذرے ہوں گے کہ عزیز کا تار آیا کہ میں آرہا ہوں ۔ پانچ چھے گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا ۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی ۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انھوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی ۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع ہی سے بہت سنجیدہ اور متین رہے تھے ۔ شاید اسی وجہ سے دونوں معتدل رہے ۔ عزیز کا خیال تھا کہ ہوٹل میں اٹھ جائے لیکن میرا دوست جن کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا ۔ آوٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولھاپور گیا تھا ۔ اس لئے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا ۔ تین کمرے تھے ۔ ایک میں جانکی سو سکتی تھی ۔ دوسرے میں عزیز ۔ یوں تو مجھے ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہئے تھا ۔ لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی ۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہیں کیا تھا ۔

رات کو دونوں سینما چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا۔ اس لئے کہ میں فلم کے لئے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی۔ اس لئے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔ رات کو چاہے میں بہت دیر تک کام کروں۔ ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں۔ اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں۔ حسب عادت اس رات بھی میں پانی پینے اٹھا اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا عزیز کے پاس تھا اور اس میں میری صراحی پڑی ہوئی تھی۔

اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اس لئے مجھے دستک دینی ہی پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا "سعید صاحب! اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی "اوہ" اس کے منہ سے نکل گئی۔ اور پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لئے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی۔

"عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انھیں زکام ہو جاتا ہے —— میں نہیں تھی تو پشاور میں ایک مہینہ بیمار رہے۔ اور رہتے بھی کیوں نہ، جب دوا ہی چھوڑ دی تھی۔ آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔" اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لئے کہا۔ "مجھے کل یہاں پہنچتے ہی انھیں تار دینا چاہئے تھا۔ کتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ انھیں کتنی ہی تشویش رہی ہوگی۔ اس نے مجھ سے

تار کا مضمون بنوایا جس میں بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔

چار روز گذر گئے۔ جانکی نے سعید کو پانچ تار روانہ کیے۔ پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بمبے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمار داری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی "سعادت صاحب! میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں۔ ورنہ وہ میرے تاروں اور خطوں کا جواب ضرور لکھتے۔

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا

"میں بہت بیمار ہوں، فوراً چلی آؤ" تار آنے سے پہلے جانکی کسی بات پر بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔ عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار گذری۔ کیوں کہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علٰحدہ علٰحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا ہے۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا "میں جاتی ہوں، لیکن بہت جلد واپس آؤں گی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "سعادت صاحب! ذرا ان کا خیال رکھئے گا۔ ابھی تک بخار دور نہیں ہوا"

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی میں بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ لیکن

جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد جانکی جلدی جلدی لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اور اس کی غیر موجودگی میں اس نے دوا پی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی۔ لیکن آدھے گھنٹے کے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مندرہی تھیں، عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دباشور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر جا لیٹی۔ سہ پہر کو جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے باہر نکلا تو عزیز اپنے کمرے میں اپنا اسباب رکھوا رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا "بمبے ـــــ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ یکے میں بیٹھا اور چل دیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اس کو برونکائٹس ہے۔ اگر احتیاط نہ برتی تو نمونیہ ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دے کر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا اس لئے میں نے کہہ دیا کہ چلا گیا ہے۔ یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک تکیے میں سر دے کر روتی رہی۔

دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب جب جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور طبیعت

بھی کسی قدر درست تھی۔ بمبے سے سعید کا تار آیا۔ جس میں بڑے درشت لفظوں میں لکھا تھا۔
"یاد رہے، تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا" میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونہ ایکسپریس سے بمبے چلی گئی۔

پانچ چھے دن کے بعد نراین کا تار آیا۔ ایک ضروری کام ہے فوراً بمبے چلے آؤ۔ میرا خیال تھا کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کانٹریکٹ کی بات کی ہو گی۔ لیکن بمبے پہنچا تو معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونا سے بمبے پہنچی تو اندھیری جانے کے لئے چلتی ٹرین پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی اور اس کی دونوں رانیں بری طرح چھل گئی تھیں۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کر کے کہا ــــ "مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ" تو اسے بہت ہی روحانی تکلیف ہوئی۔ نراین نے مجھے بتایا "سعید کے منہ سے یہ برف جیسے ٹھنڈے الفاظ سن کر وہ ایک لمحے کے لئے بالکل پتھر ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے لئے ضرور سوچا ہو گا۔ میں گاڑی کے نیچے آ کر کیوں نہ مر گئی۔ سعادت! تم کچھ بھی کہو۔ سعید عورتوں سے جیسا سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے ــــ بیچاری کو بخار تھا۔ چلتی گاڑی سے گر پڑی تھی۔ اور وہ بھی اس خرذات کے پاس جلدی پہنچنے کے لئے، لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا اور ایک بار پھر اس سے کہا ــــ "مہربانی کر کے یہاں سے چلی جاؤ" ــــ اس کے لہجے میں غصّہ کسی جذبے کا اظہار نہیں تھا۔ بس ایسا تھا جیسے مانو ٹائپ کی مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر نکل آئے" مجھے بہت دکھ ہوا۔ چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ شام کو جب واپس ہوا تو جانکی موجود نہیں تھی۔ لیکن سعید پلنگ پر بیٹھا رم کا گلاس سامنے رکھے، ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا ــــ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے روز اسٹوڈیو میں نراین سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک

لسٹر الڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے۔ بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ تم جاؤ اور دیکھ کے آؤ کس حالت میں ہے۔"

میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد اس کے پرخلوص استفسار نے مجھے متاثر کیا۔

اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اس کے دونوں پھیپھڑے متورم ہیں اور جان کا خطرہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔

ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نراین کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی سے کہیں غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی چھوٹی شیشیاں دکھائیں۔ جس کا منہ ربڑ سے بند تھا ــــ "جانتے ہو یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا: "معلوم نہیں ــــ انجکشن سے لگتے ہیں۔"

نراین مسکرایا: "انجکشن ہی ہیں۔ لیکن پنسلین کے۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی کیوں کہ پنسلین اس وقت بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتی تھی۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی تھی تھوڑی تھوڑی ملٹری ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے نراین سے پوچھا: "یہ تو بالکل نایاب چیز ہے تمہیں کیسے مل گئی ہے؟"

اس نے مسکرا کر کہا: "بکمین میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ آج دائیں ہاتھ ملٹری ہوسپٹل کا دروازہ کھول کر میں نے یہ تین بلب چرائے ہیں چلو جلدی کرو۔ جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل لے چلیں۔"

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نراین دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔ جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل کیوں لایا ہوں۔ میں نے یہی جواب دیا: "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

اور جب اسے معلوم ہوا یعنی زاین سرنج ہاتھ میں لئے اس کو ٹیکہ لگانے کے لئے کمرے میں آیا تو اس نے نفرت سے ایک طرف منہ پھیر لیا۔ اور مجھ سے کہا "سعادت صاحب اس سے کہئے چلا جائے یہاں سے" زاین مسکرایا "جان من غصہ تھوک دو۔ یہاں تمہاری جان کا سوال ہے"۔

جانکی کو طیش آگیا۔ نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی "سعادت صاحب میں جاتی ہوں یہاں سے یا آپ اس حرام زادے کو نکالتے باہر"۔

زاین نے دھکا دے کر اسے لٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا ــــ "یہ حرامزادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا۔ خبردار جو تم نے مزاحمت کی"۔

یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی سے جانکی کا بازو پکڑا۔ سرنج مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی۔ اس کا ڈنڑ صاف کیا ــــ اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو میں داخل کر دی۔ وہ چیخی لیکن پنسلین اس کے بازو میں جا چکی تھی۔

جب زاین نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ زاین نے اس کی بالکل پروا نہ کی اور اسپرٹ والی روئی سے انجکشن والا حصہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پہلا انجکشن رات کے نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے کے بعد دینا تھا۔ زاین نے مجھے بتایا کہ اگر تین کے ساڑھے تین ہو گئے تو پنسلین کا اثر زائل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ جاگتا رہا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹوو جلایا۔ سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔

جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ زاین نے دوسرا بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرنج کی ٹرٹی اندر گھسو دی۔ جانکی کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ زاین نے دوا اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا "تیسرا تین بجے"۔

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا اور چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب میں بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آرہی تھی اور زاین ہوٹل کے بیرے سے برف کے لئے کہہ رہا تھا کیوں کہ اسے پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔ صبح نو بجے انجکشن دینے کے لئے جب دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے زاین کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ زاین مسکرا دیا۔

"کہو جان من کیا حال ہے ؟"

جانکی خاموش رہی۔

نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا "یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں۔
ہار اور نمونیہ دور کرنے کے ہیں۔ جو میں نے ملٹری کے ہسپتال سے بڑی صفائی کے ساتھ چرائے ہیں۔ لو اب ذرا الٹی
ٹ جاؤ اور کولھے پر سے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو۔ کبھی لیا ہے یہاں انجکشن ؟"

یہ کہہ کر اس نے جانکی کوئی مزاحمت کرے۔ نرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی
مجھ سے کہا "اسپرٹ لگاؤ"

جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کر دیں تو نرائن نے کہا "جانکی ! ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ۔ میں
شن لگا کے رہوں گا"

غرضیکہ پانچواں انجکشن دے دیا گیا۔ پندرہ اور باقی تھے جو نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے
ریہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔

پانچ انجکشنوں سے گو جانکی کو بظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا لیکن نرائن کو پنسلین کے اعجاز
یقین تھا اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق
یں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نوکر میرے نام کا تار لے کر آیا۔ پونا سے ایک فلم کمپنی نے مجھے
ر بلایا تھا۔ مجھے جانا پڑا۔ دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی کے کام سے بمبئے آیا۔ کام ختم کر کے جب میں
ھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل میں ہے۔ ہوٹل بہت دور شہر میں تھا۔
ں لئے رات وہیں اندھیری رہا۔

صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔
سرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس
ا اور نرائن نے جو اس کے ساتھ لیٹا تھا۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا "آؤ منٹو آؤ —— میں ہمیشہ ہی
دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں —— آؤ یار آؤ —— بیٹھو کرسی پہ —— لیکن ذرا یہ جانکی کی شلوار دے دینا"

# پھندنے

کوٹھی سے ملحقہ وسیع و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلّی نے بچے دیئے تھے جو پلا کھایا گیا تھا۔ پھر ایک کتیا نے بچے دیئے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے اور جو دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی ... ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی جانے کتنے برس گزر چکے تھے ... کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری، بیونتی کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلّیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیئے تھے جن کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بدعادت مرغیاں انڈے دے دیا کرتی تھیں جن کو ہر صبح وہ اٹھا کر اندر لے جاتی تھی۔

اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمی ازار بند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا پھنسا ہوا تھا۔ اس زور سے قاتل نے پیچ دیئے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہو گئی تھی اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی لیکن نہیں ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے قتل کے بعد مرغیوں نے انڈے

نہیں بلّیوں نے بچے دیئے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی۔ کتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔ گوٹہ کناری تھی جھل مل جھل مل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا۔ سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی شکلیں بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے، جنھیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے پر جب صبح ہوئی تھی تو ان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔

دلہن کو جانے کیا سوجھی کمبخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا جو بڑا گل گوتھنا لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مر گئی.... باپ بھی ... دونوں کو بچے نے مارا... اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکاتے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے جو اسے گھورتے تھے۔ اس کو چھیچھڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے، حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کے آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا مگر وہ نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں۔ مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔

اب کتے بھونکنے لگے۔ نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کتوں کے ہر فرش پر اچھلیں، یہ کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں۔ کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔

جانے کیا ہوا ان کتوں میں دو زہر کھا کر مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیڑ عمر کی [illegible] کھا گئی۔ یہ اس نوجوان کی جگہ آئی تھی جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا [illegible] کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندا ڈال کر۔

اس کی ماں تھی ادھیڑ عمر ملازمہ سے عمر میں چھ سات برس بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی نہیں تھی۔ ہر روز صبح و شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی اور بدعادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔

آملیٹ بناتی تھی جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتے تو ان کے باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سہیلی آئی ـــ پاکستان میل موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی۔ ایل۔ بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی تھیں۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی بلاؤز اتاری۔ پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ ابلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے... اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ ابلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ہل ہل کر گتگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئے۔

اس سہیلی کا بینڈ بج گیا... مگر وہ وردی والے سپاہی پھندنے نچانے نہیں آئے۔ ان کی جگہ پیتل کے برش تھے۔ چھوٹے اور بڑے جن سے آوازیں نکلتی تھیں گرج دار اور دھیمی... دھیمی اور گرج دار۔

یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔

پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا... ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اسے بہت دلاسہ دیا۔ بے چاری کو اپنی شادی یاد آ گئی تھی۔

رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی وہ روتی رہی وہ ہنستا رہا...

صبح ہوئی تو ہٹی کٹی ادھیڑ عمر کی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسہ دینے کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلا دیا گیا۔ اس کی شلوار میں اس کا لال پھندنوں والا ازار بند پڑا تھا۔ معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ ڈالا گیا۔

اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کیے ہوئے بکرے

کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں ... اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا ... مگر پہلا تو ابھی تک اترا نہیں ... ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

اس کی ماں موٹر ڈرائیوری سیکھ رہی ہے ... باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اسے دلاسہ دیتا ہے اور وہ اسے پچکارتی ہے اور دلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دلہن بھابی دونوں سیر کو جاتی ہیں۔ سہیلی کبھی پاکستان میل موٹر ۹۶۱۲ پی۔ ایل۔ سیر کرتے کرتے اجنتا جا نکلتی ہیں۔ جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویریں بن جاتی ہیں۔ رنگ ہی رنگ لال پیلے ہرے نیلے ... سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو ان رنگوں کا خالق چپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ سردیوں اور گرمیوں میں اوورکوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل و صورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرتا ہے۔ اپنے رنگوں کو چپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کراتی ہیں اور بعد میں خود چلانے لگتی ہیں۔

تینوں اجنتا میں مجرد آرٹ کے سینکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دو پیٹ ہوتے ہیں، مختلف رنگوں کے ... دوسری کی تصویروں میں عورت ادھیڑ عمر کی ہوتی ہے، ہٹی کٹی۔ تیسری کی تصویروں میں پھندنے ہی پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔

مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے ... بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے ہوئے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انھوں نے اپنے بلاؤز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔

اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا۔ ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی سٹینوگرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش اجنتا اسٹوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ اسٹکیں اس کے بکھرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں، ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی، اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی۔

اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف قسم کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہٹ جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ۔ عقب میں چلے جاؤ تو کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر۔۔۔ ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ناس سے بھرا ہوا مرتبان۔ اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ، نیچے سے دیکھو تو میراجی کی مبہم شاعری۔

فن شناس نگاہیں عش عش کر اٹھیں۔۔۔ دولہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا گیا۔ جہاں انھیں معلوم ہوا کہ ان کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن کے ہاں ہی رہتا ہے۔

اس کی ہونے والی دلہن وہی گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دوسرے لپ اسٹکوں کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع میں چند مہینے تک اس کے شوہر کو اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی لیکن جب اجنتا اسٹوڈیو بند ہو گیا اور اس کے مالک کی کہیں سے بھی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا جو بہت نفع بخش تھا۔

اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔

یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لئے تلخی کا موجب ہوئی لیکن بعد میں ایک عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سہیلی نے جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ

کا چکر لگا آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی۔ اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہر کے پودوں کے درمیان اس انداز سے اوپر تلے رکھے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئی تھیں۔ ان پر شہد کی مکھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔

اس کی دوسری سہیلی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بیہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں بیہوشی نئی تھی یا وہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا جہاں اس کا اس کی لیڈی اسٹینوگرافر کا سر سہلاتا تھا۔

اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا اب اس کو ڈرائیونگ آ گئی تھی۔ مگر بہت بیمار ہو گئی تھی مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے بچے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔

اس کی بھابی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہٹی کٹی ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں بہت پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جب کہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کر رہے تھے اس کی بھابی نمودار ہوئی وہ مجرد تھی ... اس کے ہاتھ میں قلم تھا نہ برش لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔

صبح کمرے میں سے جمے ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابی کے گلے میں لگا دیئے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی مگر ناکام رہی اس لیے کہ مقدار کم تھی ... اس نے مقدار بڑھا دی۔ حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی اور اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھرآتی تھی۔ منہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔

صبح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کے جسم کے ذرے ذرے دھاڑیں

ار مار کر روتے رہے ہیں۔ اس کے وہ سب بچے پیدا ہو سکتے تھے ان قبروں میں جو ان کے لئے بن سکتی تھی۔ اس دودھ کے لئے جو ان کا ہو سکتا تھا بلک بلک کر رو رہے ہیں ... مگر اس کے دودھ کہاں تھے۔ وہ جنگلی پتے پی چکے تھے۔

وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہ ہوتی تھی۔ ذہین تھی، پڑھی لکھی تھی، جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قایم کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

بالکل کھوکھلی ہو گئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے۔ وہ سمجھ گئی چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتی شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی ... رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔

سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لئے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا، موٹر گیراج میں اور ماں اسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی اور دوسری کاٹی جانے والی تھی۔

وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کے نپلھٹ نے ہلکی سی لرزش پیدا کی مگر اس بدذائقہ شے سے تو اس کے بچے کے ہونٹ بھی تر نہ ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے۔ نرس بہت اچھی ہے۔ اسپتال سے نکلتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے

کے باعث اسپتال میں مرگئی۔

اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے اس نے علیحدہ کر دیئے۔ ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لئے اس نے آیا رکھ دی ... کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آہستہ آہستہ ان سے بھی چھٹکارا مل جائے۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھتی "چلے جاؤ ... جو کوئی بھی تم ہو چلے جاؤ ... میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی"

سیف میں اس کی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے جن سے اس کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر کنسٹری آواز میں فحش نغمے گاتی تھی۔ آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی اس لئے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے مگر اس میں وہ زبردست حجاب محسوس کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ پیے اور خوب پیے اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدد لے ... مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر سرپوش ہو گیا تھا۔

تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی ... ایک عرصے اس کی پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی اور اپنے جسم پر نئے خدوخال بنانے شروع کئے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی۔

وہ اپنا سامنا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی بن کھائے پیے۔ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگلے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا ... آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان

کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے زنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا ... ایک آدمی ہاتھ میں چھرا لیے منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے مگر جب وہ مڑی تو حملہ آور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کا رخ کیا کبھی ادھر کا ... آخر جو رستہ ملا اس میں سے بھاگ نکلا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگی چیختی پکارتی "ٹھہرو ... ٹھہرو ... میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی ... ٹھہرو"

گرجور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چمڑے کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی ... اچانک اس کی نظریں آئینے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس پر خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے گھونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلوبند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا

دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے۔ وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑے رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔